

چراغِ یزدگرد



آفاق کا ہر جلوہ اپنا ہی کرشمہ ہے
آئینوں میں اپنی ہی تصویر نظر آئی

ڈاکٹر سید صفدر حسین



Pdf, By Miskin Mazhar Ali Khan

CEL No, 00966590510687

گروپ، خاکہ، حلم

پریچہ درود رحم

ذکر پندھ

چند روز حرم

نکات

طبع اول

سال طبع

کتابت

مطبوعہ

ایک ہزار

۱۹۶۴ء

سید تنزیب حسین امروہوی

جادید پریس - کراچی

قیمت

چار روپے

ناشر

بارگاہ ادب، ۱۳۰۲ ڈرگ کالونی، کراچی ۲۵

مجموعۂ غزلیا

رہ طلب میں اندھیرا نہیں اُجالا ہے

یہ جلوہ گاہِ خدا ہے وہ جلوہ گاہِ صنم

تجلیِ دلِ ایماں، ضیائے دیدہٴ کفر

قدمِ قدم پہ فروزاں چسراغِ دیروِ حرم

ایستاب

اُن غزالوں کو مری چشمِ تمنا کا سلام

قافلے جن کے بنارس سے بھٹکے پیچھے

فروغِ دیدہ دل سُرمہ نگاہ بنے

تمہاری راہ کے ذرے بھی مہرِ ماہ بنے

ترتیب

تاثرِ ذات

(سید محبتی حسین)

تاثرِ فن

(مختار صدیقی)

فکرِ گاہ گاہ

(غزلیاتِ زمانہ ماضی قریب)

کاوشِ پیام

(غزلیاتِ زمانہ ماضی بعید)

نوائے پریشان

(مفتی محمد شفیع)

ماثر ذرات

ڈاکٹر سید صفدر حسین سے پہلے پہل میری ملاقات کراچی سے نکلنے والے ایک ادبی ماہنامہ کے دفتر میں ہوئی۔ رسمی تعارف کے بعد ہی صفدر صاحب نے میری کتاب پر نہیں بلکہ کتاب کے سلسلہ میں بعض ناقدوں کی رائے پر تبصرہ شروع کر دیا۔ وہ بے لاگ لہجے میں گفتگو کر رہے تھے۔ باتوں میں کوئی پیچ، کوئی کپٹ، اظہارِ رائے میں کوئی جھجک، کوئی ڈپلومیسی نہیں تھی، یہ ضرور ہے کہ باتیں وہ رک رک کر کہے تھے۔ آواز نہ تیز تھی نہ ہلکی۔ جب کسی نکتہ پر ضرور دینا چاہتے ذرا سا توقف کرتے نظریں جھکاتے، ذرا سے سکوت کے بعد نظریں اٹھا کر آنکھیں ملا کر وہ ”نکتہ“ بر ملا کہہ دیتے۔ اُن کا لہجہ براہِ راست تھا۔ اس لہجے میں تھوڑا سا ”اکھڑپن“ بھی ملا ہوا تھا۔ یہ نہیں کہ صفدر صاحب کے الفاظ میں کوئی درشتی یا جارحیت تھی۔ اُن کے الفاظ چتے تلے اور شائستہ تھے مگر جو لہجہ انھیں ادا کر رہا تھا وہ ان الفاظ کو کبھی نرم اور کبھی گرم کر رہا تھا۔ اس میں کبھی مبارزت طلبی کبھی صلح جوئی تھی مجھے صفدر صاحب کی بعض باتوں سے اختلاف تھا — مگر اُن کا لہجہ جو اس وقت قدرے ”کھردرا“ معلوم ہو رہا تھا مجھے متاثر کئے بغیر نہ رہ سکا۔

اس کمزوری سے جو بہت عام ہے، بچے ہوئے ہیں۔ ہر قسم کے ادبی نظریات کو سُننے اور سمجھنے پر وہ تیار رہتے ہیں۔ جدید ادب ہو یا قدیم دونوں سے انہیں والہانہ شفقت ہے۔ ادبی معاملات میں وہ تنگ نظری سے کام نہیں لیتے۔ اگر وہ چاہیں بھی تو ایسا نہیں کر سکتے۔ اُن کی بے چین اور ہمہ وقت سرگرم جستجو شخصیت انہیں توہمات اور تعصبات کی زنجیریں توڑنے پر برابر اُکساتی رہتی ہے۔

صفدر صاحب کا ادبی مطالعہ وسیع اور گہرا ہے۔ وہ اعلیٰ پایہ کے محقق بھی ہیں اور ناقد بھی۔ مگر علیٰ اور ادبی مباحث پر گفتگو کرتے وقت اُن کی باتوں میں گراں باری اور خشکی نہیں پائی جاتی۔ اُن کی جاندار شخصیت خشک مباحث کو بھی گوارا، دلکش اور دلچسپ بنا دیتی ہے۔ اُن کی گفتگو میں ایک خاص قسم کی سادگی اور شعریت ہے۔ گفتگو کی یہی شعریت اُن کی نظموں میں بھی ملتی ہے۔

— صفدر صاحب شاعر بھی ہیں اور نظموں کو پڑھتے بھی خوب ہیں۔ میں نے اُن کو مضمون پڑھتے بھی سُنا ہے اور اشعار بھی۔ دونوں چیزوں کو وہ اس طرح پڑھتے ہیں کہ مفہوم کی دلکشی بڑھ جاتی ہے۔ اُن کی شعر خوانی بالخصوص ایک انفرادی رنگ اور لہجہ رکھتی ہے۔ بر محل اور مناسب اشاروں لہجے کے اتار چڑھاؤ اور چہرے کے تاثرات سے وہ ایک ڈرامائی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں۔ اور شعر اپنی پوری معنویت اور حُسن کے ساتھ مجسم ہو کر سامنے آ جاتا ہے۔ صفدر صاحب صحیح معنوں میں بڑے باکمال فن کار ہیں۔ ادب اُن کی تحریر اور تقریر دونوں میں فن کی پختگی بن کر ابھرتا ہے۔

صفدر صاحب ادب اور زندگی دونوں میں طہارت اور نفاست

کے حامل ہیں۔ اسی وجہ سے اُن کی نجی زندگی، اُن کی ادبی زندگی، اُن کی مجلسی زندگی میں کوئی ٹکراؤ یا تضاد نہیں ہے۔ وہ غیر منقسم اور مربوط شخصیت کے آدمی ہیں۔ اُن کو سمجھنے میں دقت نہیں پڑتی۔ انہیں سمجھنا ہو تو اُن کی گفتگو سن لیجئے۔ اور آپ کو صفدر صاحب اُس میں لگے ملتے ہوئے، روٹھتے ہوئے، سنتے ہوئے، بحث کرتے ہوئے، تنقید کرتے ہوئے، شعر پڑھتے ہوئے، سوچتے ہوئے، گنگناتے ہوئے، ہنستے ہوئے، قہقہے لگاتے ہوئے اور کبھی کبھی چپکے چپکے آنسو بہاتے ہوئے مل جائیں گے۔ اُن کے ہاں کوئی چیز تہہ در تہہ اور لبادہ پہنے ہوئے نہیں، جو چیز ہے، جیسی بھی ہے، سامنے ہے۔ اُن کے چہرے کی طرح ان کا دل بھی روشن ہے۔ ایسی روشنی بہت کم لوگوں کو ملتی ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ اپنے دوستوں کے لیے ایک روشنی ہیں۔

مجتبیٰ حسین کراچی

۳۱ دسمبر ۱۹۶۳ء

ناثرِ فن

یہ کس کے لب ہیں زمزمہ پرداز دیکھنا رقصاں ہے دل میں شعلہ آواز دیکھنا

ترا انکار جھوٹا ہے کہ تیرا دل دھڑکتا ہے تبسمِ کوشِ آنکھوں میں جھلکائی نمی کیسی

آفاق کا ہر جلوہ اپنا ہی کرشمہ ہے آئینوں میں اپنی ہی تصویرِ نظر آئی

ہو چکے اہلِ تقیوں وادعیِ اہام میں گم اہلِ شک منزلِ الہام تک آپہنچے ہیں

بے چارگی جذبہ اصلاح نہ پوچھ کہ فسادِ ازلی خلقتِ تعمیر میں ہے

ہر سانس ایک گام ہے ہر لمحہ اک سفر منزلِ تھکن کا نام ہے دنیا سفر میں ہے

صفدر صاحب کے یہ اشعار ایک سرسری نظر نے "چراغِ دیر و حرم" کی تجلیوں میں دیکھے ہیں۔ ان کا تعلق ان کی شعری زندگی کے مختلف ادوار سے ہے لیکن ان کے پیچھے شعری شخصیت کا جو لب و لہجہ کار فرما ہے۔ اس کی دو نہایت

نمایاں خصوصیتیں صاف طور پر ہر جہ سے نظر آتی ہیں۔ یہی علامہ کی لکھی اور
 بیان کی جزالت۔ مندرجہ بالا اشعار کو ہی دیکھئے۔ پہلا شعر محفل ناز کے محاکات
 کا ایک خاص منظر ہے۔ ایسے محاکات میں گئی کلام متوقع ہے۔ دوسرا شعر اس
 سے بھی مختص نوعیت کا ہے۔ اس کے محل وقوع میں صرف دو شخصیتیں موجود ہیں۔
 ایک تو شاعر دوسرے اُس کا مقصود و متنا۔ اس محل وقوع میں کہ شاعر ملاقات کے
 لئے اصرار کرتا ہے۔ اور جیسا کہ ہوتا آیا ہے۔ انکار ہی سنتا ہے۔ پہلا ردِ عمل یہ ہونا
 چاہئے تھا کہ شعری شخصیت کسی اضطراب یا کسی مایوسی کا شکار ہوتی، لیکن اس
 کے برعکس اس شعری شخصیت کا اعتمادِ نفس، غیر متزلزل رہتا ہے اور اسی اعتمادِ
 نفس کا نتیجہ ہے کہ اس ملاقات میں مشاہدہ حُسن کا یہ محاکاتی شاہکار لمبے کے
 اس تیقن اور کلام کے اس زور اور گرمی کے ساتھ وجود میں آیا ہے۔ تیسرے شعر
 کی بنیاد ہمہ اوست کا وہ تصور ہے جس سے فارسی شاعری کا ایک معتد بہ
 حصہ مالا مال ہے۔ لیکن شعری شخصیت کا اعتمادِ نفس اس فلسفے کے مالہ و
 ماعلیہ پر قانع نہیں تھا۔ اس نے اپنے تدبیر اور فکر سے ہمہ اوست کے بعد
 ہمہ از اوست کی منزل کو بھی دیکھا اور پھر انسانی خودی کے لانا تھا امکانات ترقی
 کو بھی جانچا۔ اس کے بعد بڑے اعتماد کے ساتھ اُس نے یہ حکم لگایا کہ آفاق میں بوتلوں کے
 جملہ مظاہر میرے ہی مظہر ذات ہیں۔ اور جس کی صفات کا میں مظہر ہوں اُس کی بے چگونگی او
 بے ہمتائی کا تو کسنا ہی کیا۔ اگلے دو شعر دورِ حاضر کی نامزدائی، اس کی بے آقداری او
 شک پرستی پر بھرپور طنز اور محاکہ ہیں۔ پھر آخری شعر اس ازلی ابدی سفر کا ایک
 اشاریہ ہے جو صرف سوچنے اور سمجھنے والی شعری شخصیتوں کے لیے ہی اہم ہو سکتا ہے۔

اس حاشیہ فرسائی کا مقصود یہ ہے کہ مندرجہ بالا اشعار میں مضامین کا تنوع اتنا ہے کہ ایک شعر، مضمون اور موضوع کے سلسلے میں دوسرے سے نہیں ملتا۔ لیکن موضوع اور اس کے اظہار میں ہر جگہ ایک بات مشترک ہے اور وہ یہ ہے کہ ان اشعار کی خالق شعری شخصیت کا اعتمادِ نفس جس کی بدلت کلام میں گرمی اور تڑپ، اور بیان میں جزالت پیدا ہوئی ہے، ہر شعر میں بھرپور انداز سے کار فرما ہے۔

اس مجموعے کی تمام غزلیات موضوع کے اعتبار سے بے حد متنوع ہیں ان میں محاکات اور معاملات سے لے کر خارجی مظاہر کا حسن، صبح و شام کے مناظر کا کیف، زندگی کے پست و بلند، اور ذات و کائنات پر حکیمانہ افکار تک ملتے ہیں۔ یہ شاعر کی محض گرمی طبع کا کرشمہ نہیں جو عام زندگی میں طبیعت کا تلون کہلاتی ہے بلکہ اس تنوع کی بنیاد اس نفسیاتی پیچ سے کہیں زیادہ گہری ہے۔ یہ شاعر کے فکر کی ہمہ جہتی اور ہمہ سویی ہے۔ کیونکہ یہ تنوع صرف مضامین اور موضوعات کے انتخاب اور اظہار تک محدود نہیں رہ جاتا، اس کا دامن، شاعر کے اسلوب (بلکہ اسالیب) تک پھیلا ہوا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ (ظاہری معنوں میں)، ان غزلیات کے کئی اشعار میں شاعر اتنا روایت پرست نظر آئے گا کہ جنوں کا راستہ روکنے والی بیڑیوں اور منت کے طوقوں تک کا ذکر کرے گا (یہ وہ طوق و سلاسل نہیں جو جدت پسند شعرا کے ایک طبقے کی مخصوص سیاسی پُنج کی بدولت، چند برس پہلے تک فیشن ایل مضامین غزل بن گئے تھے) اس روایت پرستی کو شاعر نے اسی خلوص فکر سے اپنایا

ہے جس طرح وہ اپنے دل کے معاملاتِ محبت کا بیان کرتا ہے۔ لیکن اس روایت پرستی کے بعد اُس کے فکر کی ہمہ جُوتی اسلوبِ اظہار کے دوسرے میدان بھی دھوئی ہوئے ہیں۔ اُدھر دیئے ہوئے اشعار کو ایک بار پھر دیکھئے۔ پہلے شعر کا چشمہ فیضِ مومن کا شعلہ آواز والا شعر محض موضوعاً ہی نہیں، اس شعر کا لب و لہجہ، اس کے تیور، اس کے الفاظ کا در و بست، سارے کا سارا مومن کا فیضان ہے۔ لیکن شاعر کا اپنا خلوص ذاتِ پھر بھی اس میں کار فرما ہے۔ کیونکہ اس شعر کا ماحول مومن کے معاشرے کا ماحول نہیں۔ یہ آج کل کی غنائی دُھن کا شعر ہے کیونکہ اس ماحول میں فنا کی تحسین کا والہانہ پن ہے اور بس، اس میں وہ نفس پرستی نہیں جو مومن کے شعلہ آواز والے شعر کا ایک حصہ تھی۔ اسی طرح معاملاتِ دل کے سلسلے میں دوسرا ہی شعر اس مجموعہ کے اشعار کی اس صورت پر ضرور نمائندگی کرتا ہے کہ اس میں حسرت کے لہجے کی آب و تاب اور محبت کی معاملہ فہمی کا جادو ہے لیکن اس کا ماحول بھی ملامتِ جدید معاشرہ ہے۔ حسرت کے پردہ پوش ماحول کی چوری چھپے کی کیفیت کے عکس اس شعر میں ایک خاص آزادی اور ”بے دھڑک پن“ ہے۔ — باقی اشعار میں زندگی کے کوائف اور ذات و کائنات کے مختلف پہلو جس طرح بیان ہوئے ہیں اُن میں وہ لب و لہجہ ملتا ہے جو اقبال کی پیرائے سخن سرائی کے بعد ہی اُردو غزل کو مل سکا جس کی لئے اگر تیز ہو تو خطابت اور بلند آہنگی بن جاتی ہے۔ اگر ذرا جھمی ہو تو فراق کی آفاقیت، اصغر کی معارف نوازی اور فانی کے فلسفہٴ غم کو شہی کے روپ دھارتی ہے۔

میں نے اپنے مندرجہ بالا معروضات کے سلسلے میں عمدہ اصفدر صبا

کی غزلیات میں سے انتخاب کردہ اشعار مثلاً درج نہیں کیے بلکہ صرف انھیں اشعار
 تک اکتفا کی جو ان سطور کا سرنامہ ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ زیادہ مثالیں دینے
 سے میری بات واضح ہونے کی بجائے بکھر کر رہ جاتی۔ صفذد صاحب کے
 ہاں مضامین اور اسالیب کا یہ تنوع اتنا زیادہ ہے کہ کہیں سے چار پانچ اشعار
 اگر مختلف موضوعات پر چھانٹ لیے جائیں تو یہ نکتہ واضح ہو جائے گا کہ ان غزلیات
 کا خالق ذہن، اپنی ہمہ جونی اور ہمہ سونی کے لیے قدیم شعری روایت سے لے کر جدید
 ترین ماحول و معاشرے اور زندگی کے جلی اور ہنگامی تقاضوں تک کے میدانوں
 کا شہسوار ہے۔ کلاسیکی نغمہ طرازی کی دھن صفذد صاحب کے فکری پس منظر کا اگر
 غالب رنگ ہے تو اس میں مشاہدے اور تجربے، خیال اور جذبے کی ہم آہنگی نے
 ایک مخصوص انفرادیت کا رنگ بھی اُجاگر کیا ہے۔ طبع کی جولانی اور جذباتی ماحول
 کی سازگاری نے اگر معاملات محبت کو الجھنے سلجھنے کی رنگارنگی دکھائی ہے تو سوچنے
 والے ذہن اور دیکھنے والی آنکھ نے ذات و کائنات کے تقاضوں سے بھی باخبر رکھا
 ہے۔ زمانے کا لگاؤ اور بناؤ معاشرتی زندگی کی تگاپوئی، اس میں فرد کے زندگی کرنے
 کے جیلے اور فرد کے سنورنے کے ہفت خواں — یہ تمام بوتلوں نیاں مختلف
 لہجوں اور مختلف ترکیبوں میں ان غزلیات میں درآئی ہیں اور اس فنی چلا اور سنخوری
 سے درآئی ہیں کہ شاعر کا یہ دعویٰ محض دعویٰ نہیں حقیقت حال ہے۔

چھوٹے جاتا ہوں وہ کانٹے جو کم آزار سے ہیں آہی جائے گا کوئی آبلہ پا میرے بعد

مختار صدیقی

فکر گاہ گاہ

غزلیاتِ زمانہٴ ماضی قریب

۱۹۴۴ء تا ۱۹۶۲ء

زیبِ عنوانِ تکلم ہے وہی اِسمِ جمیل
جس کی خوشبو سے مہکتا ہے دیارِ تحنیل

اک دم سر ہے اب یاد صبا میرے بعد
 قدرے عشق رہے گی تری کیا میرے بعد
 جو رِنا دیدہ سے محروم نہ رکھے مجھ کو
 چھوٹے جاتا ہوں وہ کانٹے جو کم آزار سے ہیں
 سرمہ چشم فسون گرنہ حسا کی سُرخِ
 اٹھ گیا شیوہ تسلیم مرے اٹھتے ہی
 دیکھنا غور سے رخسارِ خیس کی زردی
 کیوں مٹائے کم آ میری محبوب کا غم
 محفلیں عہدِ گذشتہ کی ہوئیں اب بُخیاں
 مل گیا مجھ کو مرے ذوقِ شہادت کا صلہ
 دلفریب آج بھی ہے آپ کا نقشِ کفِ پا
 میں نہیں ہوں تو بیاباں بھی ہے اک بزمِ خموش
 فکرِ آزاد کے بے لاگ تقاضے نہ رہے
 پھسکی پھسکی سی ہے گلشن کی قضا میرے بعد
 کس کو پہنائے گا تو تاجِ وفا میرے بعد
 کس کے کام آئیگی یہ مشقِ جفا میرے بعد
 اُسی حبائے گا کوئی ابلہ پامیرے بعد
 خیم کا کُل ہے نہ وہ چپتِ قبا میرے بعد
 لٹ گیا قافلہ مر و وفا میرے بعد
 آئینہ تم کو دکھائے گی وفا میرے بعد
 ہے خجل اپنے تغافل پہ حیا میرے بعد
 کھو گئے اپنے غموں میں رفا میرے بعد
 بوئے خوں باطنی پھرتی ہی صبا میرے بعد
 نہ ہوا سجدہ بے لوث ادا میرے بعد
 خامشی ڈھونڈھتی ہے نغمہ سرا میرے بعد
 یاد کرتا ہے مجھے رہنما میرے بعد

ایک بھی طرف نہیں بادۂ رنگیں کا حریف ہنسی پھرتی ہے مے ہوش بُبا میرے بعد

دل کہ تھا زینتِ آرائشِ گیسوِ صقدر

جب کھلی زلف تو یہ پھول گرا میرے بعد

ہر منظر تماشا ہے وگر دیکھ رہے ہیں جتنے ہوئے قطروں کو گہر دیکھ رہے ہیں
 تنظیم تری اہل نظر دیکھ رہے ہیں کانٹوں میں نمودِ گل تر دیکھ رہے ہیں
 چونکی ہیں ابھی مینڈیٹ و بی ہوئی آنکھیں کھلتے ہوئے مینجانے کا در دیکھ رہے ہیں
 اب گردِ کفن پا ہیں دیارِ مرہ و انجسم قدسی مری پر وارِ نظر دیکھ رہے ہیں
 رُخ چھوٹے ہوئے مسکنِ آدم کی طرف ہے افلاک نشیں غمِ بشر دیکھ رہے ہیں
 چھٹکی ترے کھڑے کی ہے یہ چاندنی جب ہم شام میں اندازِ سحر دیکھ رہے ہیں
 اللہ سے ترے عارضِ تاباں کی تجلی دیکھا نہیں جاتا ہے مگر دیکھ رہے ہیں
 ہم اپنے ہی قدموں کی تجلی کا تماشا تا منزلِ نور شید و قصر دیکھ رہے ہیں
 کچھ لوگ ہوئے شوق سے خود زینتِ آتش کچھ لوگ تماشا سے شر دیکھ رہے ہیں
 ہونٹوں پٹی آنکھ میں معصوم شرارت نیرنگِ ادا شام و سحر دیکھ رہے ہیں
 اللہ غنی حسنِ نظر کا یہ کرشمہ آنکھیں ہیں کدھراور کدھر کچھ رہے ہیں
 طاقوں سے گرے جاتے ہیں صنایِ خیالی ہم بہت شگنی ہائے نظر دیکھ رہے ہیں
 اے نبضِ دو عالم تری رفتار میں صفد آج اپنے ترانوں کا اثر دیکھ رہے ہیں

برہم ہے نظامِ غمِ دوراں کئی دن سے
 اک شوق ہے پھر سلسلہ جذباں کئی دن سے
 ارمان ہیں سینے میں غزل خواں کئی دن سے
 آیا نہیں وہ سرِ دُخراں کئی دن سے
 تم جب سے گئے آنکھ کے شعلے نہیں بجھتے
 نشتر کا طلب گار ہے ہر آبلہ دل کا
 دل پر تری زلفوں کی گھٹا جھوم رہی ہے
 گلزار ہوا صمنِ چمن پر تو رُخ سے
 انکار میں اُن کے جو ہے امتزار کا عالم
 قریا دیس کی ہوئی ممنونِ سماعت
 دل میں لبِ دُخسار کے وہ پھول کھلے ہیں
 پونچھے گئے کس دیدہ خوں بار کے آنسو
 تاثیر ہے شاید یہ مے سوزِ دروں کی
 برپا ہے تری یاد کا طوقاں کئی دن سے
 ہاتھوں میں ہے خود اپنا گریباں کئی دن سے
 ہے دیدہ و دل میں کوئی مہاں کئی دن سے
 سوئی ہیں مرے شہر کی گلیاں کئی دن سے
 دل میں بھی مسلسل ہے چراغاں کئی دن سے
 خنجر کو چکارے ہے رُگِ جاں کئی دن سے
 آنکھوں میں ہے جذبات کا طوقاں کئی دن سے
 شعلوں کی لپٹ میں ہے گلستاں کئی دن سے
 ہیں عشق و خرد دست و گریباں کئی دن سے
 موتی ہیں ترے کان کے لڑاں کئی دن سے
 بچتا نہیں آنکھوں میں گلستاں کئی دن سے
 گھلگھلوں ہے ترا گوشہِ داماں کئی دن سے
 آنسو تری پلکوں پہیں لرزاں کئی دن سے

یہ شمع جلائی ہے کس اُمید نے یارب تابندہ ہے رُئے شبِ تجراں کئی دن سے
تمید ہے شاید یہ گرفتاری دل کی زنجیری ہے دہن میں پچاں کئی دن سے

ما تھے یہ نہ چندن ہے نہ آنکھوں میں کجِ کابل
کافر نظر آتا ہے مسلمان کئی دن سے

۲۳ مارچ ۱۹۶۲ء

اہل دل کو چہ اصنام تک آپہنچے ہیں
 جو تہہ خم میں ہو باقی وہی ہے سے ساتی
 ہو چکے اہل یقتیں وادی اولام میں گم
 جب خودی کا ہے یہ عالم تو خداؤں نہیں
 پھر گئی راہ سے اُمید کی چڑھتی ہوئی دھوپ
 شوق گستاخ ہے اب پردہ کشائے اُلو
 میری قسمت کا ستار تو نہ تھا اتنا بلند
 ہم نشینوں کو مبارک کریم خاص ترا
 دیکھئے کس کو یہ اعزازِ خصوصی ہو نصیب
 کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ ترے دیوانے
 راہ پران کو لگا لایا دُعاؤں کا حلو
 ملے وہ لوگ جو ہوں لذتِ آغاز میں گم
 میری نظریں گل و گلزار سے آگے نہ بڑھیں
 فاصلے عرصہ دو کام تک آپہنچے ہیں
 بادہ کش درو تہہ جہام تک آپہنچے ہیں
 اہل شک منزلِ الہام تک آپہنچے ہیں
 بُت شکن محفلِ اصنام تک آپہنچے ہیں
 یاس کے سائے در وہام تک آپہنچے ہیں
 خاص جلوے نجمِ عام تک آپہنچے ہیں
 کس کی خاطر وہ لبِ بام تک آپہنچے ہیں
 ہم بھی اب رسمِ درہِ عام تک آپہنچے ہیں
 لبِ تے منزلِ دشنام تک آپہنچے ہیں
 تیری دھن میں تھے ہمنام تک آپہنچے ہیں
 صبح بھٹکے تھے مگر شام تک آپہنچے ہیں
 وائے وہ لوگ جو انجام تک آپہنچے ہیں
 تیرے جلوے بحرِ شام تک آپہنچے ہیں

حلقہ زلفِ گرہ گیر کے کچھ زندانی قطعہ
دیکھیں یہ سلسلہ شوق کہاں پر ٹوٹے
حلقہ گردشِ آیام تک آپہنچے ہیں
صیدِ اُم کے اُم تک آپہنچے ہیں

سہ کے دھوپ نہ صحرائے جنوں کی صفد

سایہ زلفِ سیہ فام تک آپہنچے ہیں

۲۵ دسمبر ۱۹۶۱ء



بڑپا ہوا سینے میں یہاں ماتم غم اور
 ان زہرہ جبینوں نے کئے جتنے ستم اور
 مال ہیں تو کیا اب بھی وہ اک آفتِ جاں ہیں
 انداز یہ کتا ہے کوئی ہم سے خفا ہے
 اک کیف کا عالم ہے پیش ہے نہ خلش ہے
 آسانیاں خود راہزنِ ذوقِ طلب ہیں
 اچھی نہیں اے شوق یہ آشفتمیانی
 رسوائی کو کیا کم تھیں محبت کی نگاہیں
 مہر و مہ داختم تو فقط گردِ سفر ہیں
 ہر شوقِ فسانہ ہے مری کم نظری کا
 تھا جلوہٴ نیرنگ جو مقصودِ تجلی
 تسکینِ جبین ہونہ سکی ایک خدا سے
 اے جانِ حیا تجھ کو قسم اپنی حیا کی
 اٹھ میں تری یاد میں آہوں کے علم اور
 بڑھادی رہا میری محبت کا قدم اور
 کھنچ جائیں تو بن جائیں گے تصویرِ تم اور
 دل پھر کبھی یہ کہتا ہے کہ وہ اور نہ ہم اور
 بخشا ہے تری یاد نے سپر ایہ غم اور
 دشواریاں حال ہوں تو بٹھتے ہیں قدم اور
 اُس کا کلِ شبِ نگ میں پڑ جائیں گے خم اور
 اب تیرے تغافل سے بڑھا حُسنِ ستم اور
 تاریخ بنائیں گے مرے نقشِ قدم اور
 ہر آہ پہ کھلتا ہے مرے دل کا بھرم اور
 ہر گوشہٴ دل میں ہوئے تمبیہِ حرم اور
 بیتابی طاعت نے ترشوائے صنم اور
 رکھے کوئی دن میری محبت کا بھرم اور

اللہ کرے سچ ہو یہ افواہِ محبت کھائی ہے کسی شوخ نے کچھ دل میں قسم اور
پہچان نشان رہبری و راہِ زنی کے نقش قدم اور ہیں وہ نقش قدم اور

مقصودِ بیاں ایک مگر فرق ہے صفد
واعظ کا قلم اور ہے شاعر کا قلم اور

۱۷ دسمبر ۱۹۶۱ء

سلیقے عشق کے تم نے سکھائے ہیں کیا کیا
 تری ادائے تغافل نے جن کو توڑ دیا
 ہر اک نقاب سے مکرانیں مضطرب نظریا
 جلا دیئے تھے سریراد نقش پائے چراغ
 چھٹرا کے دستِ تناسے اپنا دامن ناز
 حضورِ دوست زباں پر جو ذکرِ غیر آیا
 فروغِ عارضِ تاباں سے کل گشتل میں
 نظر اٹھی کبھی سہوا جو اسوا کی طرف
 پڑی ہے جب بھی نظر چاکِ جیب و داماں پہ
 مری غزل میں حسینوں کا تذکرہ سُن کر
 تمہارے بُخ پہ اُداسی کی اک جھلک پا کر
 ستم نواز کو جب مائلِ کرم پایا
 یہ انکشاف نہ اُن پر کہیں گراں گزے

نظر سے حوصلہ دل بڑھائے ہیں کیا کیا
 مری میں یاد وہ پیمان آئے ہیں کیا کیا
 فریبِ ذوقِ تجسّس نے کھائے ہیں کیا کیا
 حجابِ ماہِ وِ شریا کو آئے ہیں کیا کیا
 وہ بے بسی پہ مری مُکرائے ہیں کیا کیا
 مرے خلوص پہ وہم اُن کو آئے ہیں کیا کیا
 چراغِ لالہ و گلِ حبِ ملامتے ہیں کیا کیا
 ترے خیال نے زانو دبائے ہیں کیا کیا
 خود اپنے حال پہ ہم مُکرائے ہیں کیا کیا
 خطوطِ غم ترے چہرے پہ آئے ہیں کیا کیا
 دیئے اُمید کے دل نے جلائے ہیں کیا کیا
 دلوں کے بحید زبانون پہ آئے ہیں کیا کیا
 کہ ہم نے فراغِ زمانے کے کھائے ہیں کیا کیا

مرا جنونِ محبت ہے بے رنجی کا سبب اسی خیال سے آنسو بھرائے ہیں کیا کیا
 نظرِ سرودہ و دلِ خستہ و جبینِ گمراہ تری نقاب نے فتنے اٹھائے ہیں کیا کیا
 ہمارا نقشِ قدم دکھیتی چلے دنیا چراغِ راہ میں ہم نے جلائے ہیں کیا کیا
 انھیں پسند جو آیا مرابیاں صفدد
 خطوطِ ہمنفسوں کو سنائے ہیں کیا کیا

یکم جولائی ۱۹۵۱ء



وہ تبسم جو لبِ حُسن کی جاگیر میں ہے اُس کی تنویر کا حصہ مری تقدیر میں ہے
 برہمی جب سے تری زلفِ گرہ گیر میں ہے دل سمجھتا ہے کہ اُبھن مری تقدیر میں ہے
 اُن کی بیگانہ نگاہی سے فسر وہ نہیں دل وہ جواکِ گرمی جذباتِ تھی تقریر میں ہے
 پڑھ لے دل نے تری چینِ جبین کے انداز میری قسمت کا لکھا بھی اکی تحریر میں ہے
 لب پہ فریاد بھی آئی ہے تو شرمائی ہوئی خود اک احساسِ مذمت مری تعمیر میں ہے
 ہر نفس تازہ عناصر میں براگندہ نقاب کائنات آج مرے حلقہٴ تسخیر میں ہے
 اب وہ دل ہے نہ وہ دل میں تنہا کا خروش دلکشی آج بھی لیکن تری تصویر میں ہے
 رنجِ بے چارگی جذبہٴ اصلاح نہ پوچھ کہ فسادِ اذلی خلقتِ تمیر میں ہے
 کتنی دھپ ہے یہ سلسلہٴ جنبانی بھی کہ تری زلف کا خمِ حلقہٴ زنجیر میں ہے
 کیوں کوئی آئے مٹانے کو مجھے اے صفد

خود ہی تخریب کا پسو مری تعمیر میں ہے

اپریل ۱۹۴۷ء

جھک گئی گردن وفا کی وہ مقام آہی گیا
 وقت جب آیا تو جذبِ شوق کا آہی گیا
 اللہ شدتِ ذوقِ طلب کا معجزہ
 اضطرابِ شوق کی خانہ خرابی دیکھئے
 مَدَقوں کیں دل سے باتیں پیکرِ تخمیل نے
 جسکے قدموں کی دھمک خاک بن جاتی ہے پُچھو
 ہلکی ہلکی سکرابٹ کی حبسِ لہروں کے ساتھ
 گوشہ گوشہ بن گیا اک محشرِ تانِ ظہور
 اٹھ گیا انسانِ دل سے بند و آقا کا فرق
 دل کو دل سے رابطہ ہو یہ ہوا مفہومِ عشق
 دن کو دنیا کے بجائے رات کو کھا خیال
 وہ رہے میرا رہم کیوں نازِ بے جا کھینچتے

عقل منہ بکھتی رہی اور عشق کام آہی گیا
 میرے نالے سُن کے وہ بلائے با آہی گیا
 جان کھنچ کر لب پہ آئی تو جا آہی گیا
 بے ارادہ آج لب پر اُن کا نام آہی گیا
 رفتہ رفتہ اُن کا اندازِ کلام آہی گیا
 مژدہ اے زندہ کہ وہ جادو خرام آہی گیا
 آج اُن نازک لبوں پر میرا نام آہی گیا
 دل کے آئینہ میں وہ ماؤ تمام آہی گیا
 آدمی کو آدمی کا احترام آہی گیا
 ہم ادھر روٹھے ادھر اُن کا پیام آہی گیا
 صبح کا بھٹکا مسافر وقتِ شام آہی گیا
 دل کی خودداری میں لبِ بگِ فہم آہی گیا

تھے کہیں تبسّم کے پھندے کہیں نفوں کے دام

ظائرِ آزادِ صفدِ سبزِ دِرام آہی گیا

کیا جذبِ شوقِ چشمِ حقیقت نگریں ہے
 زیرِ وزر ہے کس تو بلبلِ قمر میں ہے
 تادوراک جھلک سی ہماری نظریں ہے
 کعبہ کی راہ ہو کہ کلیا کی راہ ہو
 آئینہ بھی نہ دیکھ سکا جس کو آج تک
 ہر سانس ایک گام ہے ہر لمحہ اک سفر
 آرائشِ جالِ جہاں تاب کی قسم
 منزل ہے اسکی عالمِ سود و زیاں سے دور
 خونِ دل و جو کا صلہ دے رہا ہے آج
 میرا سر نیاز کبھی حشم نہ ہو سکا
 شاید کسی غریب کی تقدیر جاگ اٹھی
 تم کائنات اور تمہیں جان کائنات
 دل کانپ کانپ اٹھتا ہے منزل کے نام سے

جو کچھ پسِ حجاب ہے وہ بھی نظریں ہے
 تسخیر کائنات نگاہِ بشر میں ہے
 شاید فلک پہ اُن کی تجلی مفسر میں ہے
 جو پاؤں اٹھ گیا وہ تری رہ گندیں ہے
 ایسا بھی ایک عکس تمہارا نظریں ہے
 منزلِ تھکن کا نام ہے دنیا سفر میں ہے
 میرے جگر کا خون بھی رنگِ سحر میں ہے
 انساں ہنوز مرعلہ خیر و شر میں ہے
 یہ رنگِ انفعال جو تیری نظر میں ہے
 کیسے کہوں کہ جذبِ تے رنگِ دیر میں ہے
 اک رحم کی جھلک جو تمہاری نظریں ہے
 تم ہو تو کائنات ہماری نظریں ہے
 صفِ قدر کوئی فریبِ دلِ راہِ بر میں ہے

رنجِ رنگیں پہ اشکوں کی روانی اب بھی ہوتی ہے
 سکوتِ عشقِ اظہارِ تنہا اب بھی کرتا ہے
 تغافل نے کسی کے کر دیا بیزار جینے سے
 ستارے بے پلک جھپکائے سنتے ہیں یہ افسانہ
 بہاروں کو جو لوٹے وہ جوانی اب نہ ہو لیکن
 یہ مانا زردل کہ کر دل اپنا کر لیا ہلکا
 ترے وعدے بدل سکتے نہیں میری طبیعت کو
 اُمیدیں ہیں چلنِ رگِ زارِ ان کا بھروسہ کیا
 سمجھتے تھے جو آنکھوں کی زبان وہ اب کہاں لیکن
 جسے سنتے تھے ہم چاند کی ٹھنڈی شاعری میں
 ہوئی مدتِ کدِ خرمِ آرزو مڑ جھانکے لیکن
 چمنِ دالوں کے آدابِ جنوں کا معجزہ کئے
 بہت کچھ بے چل ہے زندگی کو اس کا حقِ دنیا
 مے اشکوں کا مقدار اب بھی بھرتا ہے جامِ اپنا

سناے مجھ پر انکی مہربانی اب بھی ہوتی ہے
 نگاہِ نازِ صدفِ لہرائی اب بھی ہوتی ہے
 مگر اُمید و حُبِ زندگانی اب بھی ہوتی ہے
 لبِ مقابِ پرتی کہانی اب بھی ہوتی ہے
 بہاریں جب کو لوٹیں وہ جوانی اب بھی ہوتی ہے
 مگر محسوس اُن کی سرگرمی اب بھی ہوتی ہے
 ترے وعدوں پہ اکثر بدگمانی اب بھی ہوتی ہے
 بسترِ یاسوں میں زندگانی اب بھی ہوتی ہے
 نگاہوں سے دلوں کی ترجمانی اب بھی ہوتی ہے
 ستاروں کی زبان پر وہ کہانی اب بھی ہوتی ہے
 مری صوتِ ترے غم کی نشانی اب بھی ہوتی ہے
 کہ داماںِ خزاں سے گلِ نشانی اب بھی ہوتی ہے
 مگر بے کیفِ مغلّس کی جوانی اب بھی ہوتی ہے
 بغیر اُن کے گلِ رنگِ پانی اب بھی ہوتی ہے



اب بھی وہ مقدم صاحب نظر اس ہے کہ جو تھا
 جلوہ دوست قریب گاہاں ہے کہ جو تھا
 دل مرا جو ریخ ماہ و شاں ہے کہ جو تھا
 لو لگی ہو تو نہیں دیرو حرم میں کوئی نرق
 وصل کی رات ہو یا شام جدائی کی سحر
 ذہن کے طاق میں روشن ہیں امیدیں کچراغ
 یہ الگ بات کہ ہاتھ آئے نہ لپٹائے جمال
 میرے آنسو نہ تھے اُن کا تبسم نہ رُکا
 اُسے نہ ہے جذبہ تخلیق دہوائے ایجاد
 حسن رو پوش ہے اور دید کے آثار نہیں
 مجھ پہ لگتی ہے اگر دید کی تہمت لگ جائے
 دل کو نو میدی جاوید سے تسکین نہ ہوئی
 کب سے شیرازہ جذبات ہے برہم صفی

فہمہ فہمہ عمری جانب نگراں ہے کہ جو تھا
 پھر بھی دُوری کا مئے دل کو لگاں ہے کہ جو تھا
 تیری تصویر کا ہر تپہ گماں ہے کہ جو تھا
 بانگِ ناؤس میں اندازِ ازاں ہے کہ جو تھا
 میری نظروں میں بسکِ خوابِ گراں ہے کہ جو تھا
 بزمِ سستی میں دی تاج و حواں ہے کہ جو تھا
 ہر گولہ کسی محل کا نشان ہے کہ جو تھا
 شبنم و گل میں ہی ربطِ نہاں ہے کہ جو تھا
 اب بھی خوش رنگ جہانِ گزراں ہے کہ جو تھا
 پھر بھی ہنگامہ میر کوئے بُتاں ہے کہ جو تھا
 یہ نہ ہو شوق کا عالم وہ کہاں ہے کہ جو تھا
 ہجر کا بار طبیعت پہ گراں ہے کہ جو تھا
 پھر بھی وہ سلسلہ چمنِ میاں ہے کہ جو تھا

جولائی ۱۹۴۴ء

کاوشِ پیم

غزلیاتِ زمانہٴ ماضی بعید

۱۹۳۲ء ۶ تا ۱۹۴۴ء

منظر آیا تھا جن تنکوں میں خوابِ اشیاں برسوں

انھیں کو لے کے گھومائیں فضا میں آنڈھیاں برسوں

تھوڑا سا کیف لے کے تمہاری نگاہ سے
وہ ضبطِ غم کا حوصلہ مستقل کہاں
آگے ہے شوقِ قافلہٴ مہر و ماہ سے
عادت بدل گئی کرم گاہ گاہ سے
جب چاہیں آپ آگ لگا دیں نگاہ سے
نکلی تھی اک شعلہ تری جلوہ گاہ سے
آئینہ لے کے دیکھئے میری نگاہ سے
اپنا سفر مگر ہے محبت کی راہ سے
کیا چیز بن چلا ہوں تمہاری نگاہ سے
شوخی مگر رُکی نہ ادا و نگاہ سے
اذنِ سجود پا کے تری بارگاہ سے
ہے بے خبر کرشمہٴ ذوقِ نگاہ سے
اک باجھک کمر نہ اٹھا سجدہ گاہ سے
اکثر زباں کا کام لیا ہے نگاہ سے
واقع نہیں ہے عظمتِ ذوقِ نگاہ سے
میرا گلہ نہ کیجئے اپنے کو ایک دن
لے عقل تیری راہ میں آسانیاں ہی
ہونے لگی ہے ہوش میں دیوانگی شریک
گوڑاں دی غور نے چلنِ عتاب کی
جھکتی نہیں ہے اب کسی درِ چینِ شوق
نازاں ہے حسنِ شعبہٴ آب و رنگ پر
یہ سجدہ وفا ہے نسا زِ حرم نہیں
مایویٰ نظر سے منائے ہیں رازِ عشق
نازاں ہے شیخِ پاک کی دامنِ زہد پر

سلجھاؤں لاؤ شیخ و برہمن کی کشمکش
 رشتے ملاؤں ان کے تمہاری نگاہ سے
 دنیا ہمیں بھی لاکے ہی اپنی راہ پر
 ہم بچ کے لاکھ بار چلے اسکی راہ سے
 رسوائیوں کے خوف سے لب بند ہیں مگر
 صفدر تمہیں پکار رہا ہے نگاہ ہے

جنوری ۱۹۷۱ء

یہ کس کے لب میں زمرہ پرواز دیکھتا
 وصفِ زبان میں ذہن کی پرواز دیکھتا
 محفل کا رنگ بھی بُتِ طناز دیکھتا
 بدلی ہوئی ہے کیوں مری آواز دیکھتا
 مدت کے بعد آج پھر اُنکی نگاہِ لطف
 انگڑائی لی تھی آئینہ پر جا چڑھی نظر
 پر چھائیوں کا اس سے تعاقب نہ ہو سکا
 انجام کار اُن کی توجہ کے فیض سے
 آنکھیں گئیں بھی کچھ تو نہیں اُن کا اعتبار
 جنبشِ حریمِ ناز کے پردوں کو ہر چلی
 دل کو فریبِ دیرِ حرم سے ملی نجات
 کہتے نہ تھے کہ شوق کو اتنی سزا نہ دو
 رقصاں ہے دل میں شعلہ آواز دیکھتا
 کیا کیا کھلیں گے جوہرِ اعجاز دیکھتا
 کچھ کہہ نہ جائے چشمِ فوں ساز دیکھتا
 چھیڑا ہے کس نے دلِ کامے ساز دیکھتا
 دُہرا رہی ہے صورتِ آغاز دیکھتا
 تصویرِ بن کے رہ گئے انداز دیکھتا
 بے چارگی سن کر سخن ساز دیکھتا
 روشن ہے کتنا چہرہ آغاز دیکھتا
 ہنٹوں پہ آنے جائے کہیں ساز دیکھتا
 میسری نگاہِ شوق کا اعجاز دیکھتا
 راس آیا آبروئے بُتِ طناز دیکھتا
 تنگ آ کے دل نے کھول دیا راز دیکھتا

صفہ ما بھی تصورِ انجام ہے غلط

دُھندلا رہا ہے چہرہ آغاز دیکھتا

نومبر ۱۹۴۰ء



نظر میں رہتی ہے آواز میں پانی نہیں جاتی
 تری نعلوں کا سوا جس کو چن لے انکی خوش بختی
 محبت مشرب اہل وفا میں سر کی بازی ہے
 کشتے عقل کے پہلے ہیں فروغ ستاروں تک
 سنے دنیا تھے قہوں کی آہٹ دل کی دھڑکن سے
 خوشامد محبت ہر غلش جس کی حیات افزا
 امیدیں شوق کو جب تک نہ تھوڑا سا سارا دیں
 جوانی وہ حسین شے ہے کہ جا کر پھر نہیں آتی
 تصور منقول ہے اور بصیرت سر بہ زانو ہے
 حقیقت آپ ہی اپنے کو بچھا دے تو بچھا دے
 ترے فرقت کے ماروں کی تسلی کس سے ممکن ہے
 تناؤ ہے جو الفاظ میں لائی نہیں جاتی
 یہ وہ ناگن ہے جو ہر دل پر لائی نہیں جاتی
 چمک تلوار کے سلسے میں بچائی نہیں جاتی
 مگر پھر بھی جنوں کی کار فرمائی نہیں جاتی
 یہ وہ دھن ہے کہ جو ہر ساز پر گائی نہیں جاتی
 وہ کیسے دل میں جن سے چوٹ یہ کھائی نہیں جاتی
 جس یوں ہی کسی کے در سے گرائی نہیں جاتی
 یہ وہ لکڑی کمانی ہے جو بہرائی نہیں جاتی
 تری تصویر میں تیری ادا پائی نہیں جاتی
 ہماری آپ کی کوشش سے بچائی نہیں جاتی
 طبیعت خود کو بہل جاتی ہے بہرائی نہیں جاتی

محبت و حقیقت اک خدا کا راز ہے صدف

یہ وہ گتھی ہے جو منطق سے سلجھائی نہیں جاتی

اکتوبر ۱۹۴۰ء



دھون بے خودی کے ساتھ اُمرِ خودی مجھے
 دی مجھے اسے جو موت کو بھی زندگی سمجھے
 مَرین ہے تمہیں تبدیلیوں سے زندگی سمجھے
 مصیبت بھی اگر آئی تو تہیدِ خوشی سمجھے
 مبارک وہ اندھیرا جس میں دو دل اک جگہ دھڑکیں
 مبارک وہ اندھیرا جس میں دو دل اک جگہ دھڑکیں
 کسی کے ساتھ وہ لکھن فہرہ چاندنی رتیں
 ہم ان کو حاصلِ شبِ نئے تا زندگی سمجھے
 نہ تھا معلوم یا نہ کسی ن رنگ لائیں گے
 چمن والے مے مے کو برسوں تک نہی سمجھے
 جوانی کی گنگنیں شعلیں لے لے کے ٹھہریں
 ارے ہر اندھیری رات کو بھی چاندنی سمجھے
 صاحبِ تک کسی کی اک نظر کا آسرا باقی
 فریبِ لطف کی آویزشوں کی زندگی سمجھے
 محبت اک جنوں ہے اور جنوں کا کیا جانے
 مزاج اس عشق کا سمجھے گا کون لے نازِ محبوبی
 چوٹی جاتی ہے آنکھوں کی خودی اس کو کیا جانے
 تری چشمِ تغافل کو جو جبہ زندگی سمجھے
 بڑی شکل سے اہلِ لذتِ میری خودی سمجھے
 میرا بے غم خانہ ہستی کے سب پے اُٹھتا ہوں
 جگا دو ان کو جو اب تک را زندگی سمجھے

یہ اک جذبے کی شراری ہے محویت نہیں صفد

میت ہے خودی کی کون اس کو خودی سمجھے



پُر تو کسی کا دیکھ کے چشم پُر آب میں
 تم سر سے لے کے پاؤں تک اک موج رنگتے
 پردہ اٹھا تو بن کے قیامت بکھر گئیں
 چھٹکی ہوئی ہے اُن کے تسم کی چاندنی
 یاں مرتعش لبوں پر مے داستانِ شوق
 جیسے کہ ہم خفا ہیں منانے وہ آئے ہیں
 ہر خند ہے چھٹی ہوئی چٹن شعاع کی
 وہ کھنکھ گئے تو چاندنی سنسان ہو گئی
 میرے سوالِ شوق نے شعلوں کو دی ہوا
 دنیا بدل گئی تو کلمہ کیا ہے دوستو
 اب دیر کیا ہے غرض روشن طلوع ہو
 اک گونہ بخیر دی ہے مگر اس کے شمساتہ
 لے خشتِ تیرے فیض سے ہم نے یہ زندگی
 تصویر بن گیا ہوں شبِ ماہتاب میں
 حل ہو گئی بہار تھا بے شباب میں
 وہ شہزادیاں جو قید تھیں بند قلاب میں
 پھر جان پڑ گئی ہے شبِ ماہتاب میں
 واں رنگ التفات کا ہے اجنباب میں
 تلو بار اس خیال سے بے بیخ اب میں
 چہرہ جھلک رہا ہے مگر آفتاب میں
 رہ مل گئے تو نور بڑھا ماہتاب میں
 غلظت کے پھول سُرخ ہوئے بیجِ قلاب میں
 تم بھی تو وہ نہیں ہے اس انقلاب میں
 سوُج کا عکس ڈوب چکا ہے چناب میں
 کچھ رنگِ سنگی بھی ہے کیفِ شراب میں
 فس نہں کے کاٹ دی ہے جہاں خواب میں

اے جھک کے دزانیہ بھی دیکھ لے کس کس کا خون ہوتے
صفدر یہ شعر جن میں کے عکس رُخ حبیب
چمکیں گے دامنِ نگر انتساب میں



نغمے تحلیلات کے برسا رہا ہوں میں محفل پہ پوئے گل کی طرح چھا رہا ہوں میں
 دیکھیں زخمیے جذبہ رحمت کی وسعتیں کو تاہی خیال پہ شہسوار رہا ہوں میں
 دل نے حجاب بُخ سے اٹھایا تھا ایک بار اب تک اُسی گناہ پہ پھیٹا رہا ہوں میں
 چھینٹوں خونِ شوق کے دامن ہے مملکہ رنگینی ہمار کو شہسوار رہا ہوں میں
 آنکھوں میں میری جھوم رہا ہے ترا جمال خود جلوہ گاہِ نازبنا جا رہا ہوں میں
 یادش بخیر آپ کا وہ عسدرِ التفات دل کو اُسی خیال سے بہلا رہا ہوں میں
 کل شام کو جو آپ کی آنکھوں سے بہ گئے اُن آنسوؤں کے سانچے بہا جا رہا ہوں میں
 کچھ چیز ہے جو کھینچ رہی ہے نگاہ کو کچھ بات ہے جو اُن کا ہوا جا رہا ہوں میں
 یارب مری بلند نگاہی کہاں گئی کن پستیوں کی سمت گرا جا رہا ہوں میں
 دل میں تہاں دوست کا پرتو لئے ہوئے ہر ماہتابِ حسن کو شہسوار رہا ہوں میں

صفدہا کسی کے نیمِ تبسم کے سامنے
 نتو جنتیں نگاہ کی ٹھکرا رہا ہوں میں

فروری ۱۹۴۰ء

چھپو وہ راگ کہ جذبات میں طغناں ہو جائے
عشق وہ شعلہ میاں ہے وہ جہنم بند
نغم کی کوشش ہے کہ چمے کو میاں بکدو
یہی منشا ہے سلسل تری انگریزی کا
عقل نے بیخ سے سر کا دیے سارے پردے
زندگی کیا کہیں شعلہ کہیں بجلی کہیں موج
اُن کی نظر جہم سے خیم جگر کو چھو جائیں
نگہ شوق سلامت یہ حجابات ہیں کیا
اُت وہ نظریں جہنم کے جھکی جاتی ہیں
تجھ کو پلکوں پہ اُترتے ہوئے تاؤں کی قسم
ہم نے اس دل کو چراغوں سے بجا رکھا ہے
سینہ حضرتِ انساں ہو کہ قلبِ ملکوت
تظان کی جو ہے تاثیر میں مرہم مفسد

دل کے ہر ذرے کو مجبور تھا کر دیا
 آج اے بیتابی دل تو نے یہ کیا کر دیا
 کچھ نہ کام آئی محبت میں تھاری اقصیٰ
 ہم سے پہلے تھی خدا کی یہیں کشتِ خاک
 خود ہی اک دہاں تھا حرمی دہاں کا ملال
 اے تصور اللہ اللہ جلوہ سامانی تری
 میں نے ہر صوفی سے رو کا اضطرابِ شمع کو
 اُس نے پہلے عشق کی فطرت کو بخشا اضطراب
 دیکھ لے دل توڑنے والے عمری ہمت کو دیکھ
 تم سے کیا اس بات کا شکوہ کہ تم میرے نہیں
 انکی آنکھوں میں آنسو ان کے ہونٹوں پر ہے آہ
 کچھ مری بیتابیوں سے کھل گئے اُمراہِ عشق
 دیکھ لوں گا اُن کی چشم ناز کی خود داریاں
 اے نگاہِ لطف یہ کیا حشر برپا کر دیا
 اک تماشا آفریں کو خود تاشا کر دیا
 اُن کی نظروں نے خود اپنا راز افشا کر دیا
 ہم نے صحت دے کے ہر ذرے کو دنیا کر دیا
 رفتہ رفتہ اک مریضِ غم کو اچھا کر دیا
 جس جگہ نظریں جا دیں جلوہ پیدا کر دیا
 ہر نظر نے خود زباں بن کر تقاضا کر دیا
 اور پھر خاموش رہنے کا اشارہ کر دیا
 میں نے آوازِ شکستِ دل کو نغمہ کر دیا
 کیا کہیں اُس کو مجھے جس نے تمہارا کر دیا
 بے قراری نے مری اللہ یہ کیا کر دیا
 کچھ تغافل نے تم سے یہ راز افشا کر دیا
 دردِ دل نے گرتے پڑنے کا اشارہ کر دیا

عشق جس دُور پہنچا اُس دُور پہ دنیا جھک گئی اس کو کعبہ کر دیا اُس کو کلیسا کر دیا
 پر تو رُخ نے دیا پردے کو بھی حلیے کا رنگ دیدہ حیراں نے جلوے کو بھی پردہ کر دیا
 اُس نگاہِ نطف کا صفحہ ادا کر شکریہ
 جس نے دل کو محشرِ ستارِ تمنا کر دیا

جنوری ۱۹۴۰ء

گل نمبر میں چُپ کر بھی پُرافشانی نہیں جاتی
 کوئی پردہ ہو اُن کی جلوہ سامانی نہیں جاتی
 تھارے حُسن کی آشوب سامانی نہیں جاتی
 بدل دی یوں مری حالت کہ پچانی نہیں جاتی
 مری آشفۃ حالی کا تماشا دیکھنے والے
 تری معجز نگاہی تجھ سے پہچانی نہیں جاتی
 یہ کس نے رہ گز میں جا بجا جھلے لٹائے ہیں
 ستاروں کی چمک ذرق کی تابانی نہیں جاتی
 میرا خُرجان کیوں فُصلِ گل کی بے ثباتی ہے
 وہ جاتی ہے توجائے دل کی دیرانی نہیں جاتی
 مالِ خندہ سے واقف ہے لیکن اس کو کیا کئے
 گلی کی آرزوئے چاک دامانی نہیں جاتی
 مے بحدوں کی منزل ہے حد و راہ آگے
 کسی نقشِ قدم تک میری پیشانی نہیں جاتی
 پڑی ہے چھوٹ شاید اُن تپسے رُفتے تاباں کی
 فروغِ دیدہ انجم کی تابانی نہیں جاتی
 جنوں میرا گریباں چاک کدے پھر کر مَشروس
 مری صورت کسی سے آج پہچانی نہیں جاتی
 خدا کی شان ہے دعویٰ اُنیں منزلِ شناسی کا
 مری گردِ قدم تک جن سے پہچانی نہیں جاتی

مری آنکھوں نے حُقدِ خود تماشا بن کے دیکھا ہے
 کبھی پہلو سے اُن کی جلوہ سامانی نہیں جاتی

یہاں موجود ہیں قطروں میں طوفان دیکھنے والے
تماشاے جنوں ایک سقل تاثیر رکھتا ہے
رگ ہر خازنِ خون گستاں دیکھنے والے
گھریباں چاک ہیں میرا گریباں دیکھنے والے
لجھاپیں تو اٹھالے شامِ حیراں دیکھنے والے
گلوں کی حد نہیں تنگی داماں دیکھنے والے
تماشا بن چلے ہیں بٹے جاناں دیکھنے والے
نہ ہوں حیراں مرا چاک گریباں دیکھنے والے
مری جمعیتِ خاطر پریشاں دیکھنے والے
بیاباں کا بھی کچھ حق ہے گستاں دیکھنے والے
خدا کو یاد کر لیتے ہیں طوفاں دیکھنے والے
اٹھاپتوار اپنی جوش طوفاں دیکھنے والے
ادھر دیکھیں مرا چاک گریباں دیکھنے والے
سنجھل جائیں بہار کوئے جاناں دیکھنے والے
نہ گھبرائیں مرا حال پریشاں دیکھنے والے
یہاں موجود ہیں قطروں میں طوفان دیکھنے والے
تماشاے جنوں ایک سقل تاثیر رکھتا ہے
یہ کون آیا ہے اپنے مئے تاباں میں حیرے کر
نظر گل کار ہے تیری بساطِ دل کو وسعت دے
اٹھا کر آئینہ دیکھیں شکستِ رنگ کا منظر
مرا جوشِ جنوں ہے معجزہ اُن کی نگاہوں کا
یہ تازِ گل کب تک خبر لے اپنی زلفوں کی
طلبِ کئی ہے پناہِ عرضِ تجھ سے اُسکی ویلانی
دل مجبور کو مایوسیاں جب گھیر لیتی ہیں
تری ہمت نہ ٹوٹے ناؤ ٹوٹی ہے تو کیا پروا
جنوں کا سایہ تب زندہ کے دامن تک آپہنچا
یہی خوشبو کے جھونکے دہن تک پہنچے تو کیا ہوگا
میں دل کے منتشر مژدوں کو پھر ترتیب دے لوں گا

جہنم زیراب وہ بے نقاب آتے ہیں مختبریں
 انہیں پہچان لیں میرا گریباں دیکھنے والے
 سمٹائی ہے صفدر درو کی دنیا گنگا ہوں میں
 مجھے دیکھیں بال شام ہجرال دیکھنے والے

اکتوبر ۱۹۳۹ء

سنبھل چلا دل بے اختیار کیا کہنا
 تبسمِ نگہِ لطفِ یار کیا کہنا
 نہ لطف کو نہ ستم کو قرار کیا کہنا
 مزاجِ حسن کے پروردگار کیا کہنا
 تری نگاہِ کرم کی قسم وہ پہلی نظر
 حیاتِ عشق میں ہے یادگار کیا کہنا
 بڑی ادا سے ہوا تحفہٴ نیار قبول
 بڑھا دیا ہے مرا اعتبار کیا کہنا
 اٹھا دیئے ہیں تصور نے بیچ کے پڑے
 نظر کے سمنے ہے بٹے یار کیا کہنا
 بتسمِ نگہِ فتنہ زانے چھین لیا
 بیک نظر مرا صبر و تہا کیا کہنا
 کسی کے گیسوئے عنبرِ شاں کی خوشبو
 نہا کے آئی ہے فصلِ بہار کیا کہنا
 جگر کے داغِ تیک اُتری جو تبسم کی
 لہک اٹھایہ مرا لالہ زار کیا کہنا
 دم و دارِ متاعِ سفر ہیں میسے لئے
 وہ اشک وہ گُسرِ ابدار کیا کہنا
 چھپا رہا مری آنکھوں میں یوں کی طرح
 کھلانے راز مے پر وہ دار کیا کہنا
 تری اُمیدِ کرم پر پہاڑ کاٹے ہیں
 گذر دی ہے شبِ انتظار کیا کہنا
 یہ لہماے ہوئے کیت آرزوؤں کے
 ریاضِ حسن ہے دل کا دیار کیا کہنا
 بسی تھی نکمتِ گیسوِ غریب خانے میں
 ٹھٹھکی گئی ہے شمیمِ بہار کیا کہنا

فرشتے عرش کو تکتے ہیں دُور سے صفد
کہاں پہونچ گئی مُشتِ غبارِ کیا کُشت

جنوری ۱۹۳۹ء

کم سے کم دل کو صنم خانہ بنایا ہوتا اُن کے شایاں کوئی کا شانہ بنایا ہوتا
 قصہ غم کا وہ ٹھنڈا جو وقت اکسلاتا ہم نے افسانہ در افسانہ بنایا ہوتا
 عشق بکا تو مری قندہ گری کیا اے حُسن ایک دن عقل کو دیوانہ بنایا ہوتا
 قصہ طور ہے کیا آپ کا ہر ناز ہے برق آپ نے بھی کوئی افسانہ بنایا ہوتا
 پائمالی سے نکھرتے ہیں دلوں کے جوا دل کو خاک رہ بُتِ حبانہ بنایا ہوتا
 انتظار اور بھی کرتی نگہِ نازان کی شوق نے یوں جو نہ دیوانہ بنایا ہوتا
 جس کے ہر لفظ پہ معصوم نظر ٹھیک جاتی اتنا نگیں کوئی افسانہ بنایا ہوتا
 وسعتِ ذوق پرستش کا تقاضہ تو یہ تھا ذمے ذمے کو صنم خانہ بنایا ہوتا
 جب پیش ہی عبارت تھا مے دل کا مزاج تو کسی شمع کا پروانہ بنایا ہوتا
 یہ بنانا بھی بنانا ہے بنانے والے؟ اسی سے بہتر تو یہی تھا نہ بنایا ہوتا
 کھل گیا عشق پہ بیگانہ نگاہی کا فریب اور دیوانے کو دیوانہ بنایا ہوتا

قابلِ رشک ہے یہ عشق کی رودادِ مگر

تم نے صفدر سے افسانہ بنایا ہوتا



نگاہ واپس اب بن رہی ہے تر جہاں میری
 میںوں اک خاک در ماندہ مجھے پنچادے محل تک
 قیامت آتے آتے رہ گئی وہ سو گئے ورنہ
 ستارے کانپ کر ملکوں سے دامن میں اتر آئے
 مری حیرت افوں ہے مری حسرت سے افسانہ
 دل ان کی سمت پہلے ہی سے جھکتا تھا گر اب تو
 ادھر اک زلف پر خم میں آئنا پریشانی
 جنہیں نسو بہانا چاہئے وہ مسکراتے ہیں
 خدا و نا خدا دونوں ہی چپ ہیں دیکھئے کیا ہو
 تصور میں گئے بھی پیار کی باتیں بھی توتی ہیں

ٹھہرائے موت ادھوری رہ نہ جائے آستان میری
 ہے قہمت تجھ سے وابستہ غبارِ کارواں میری
 لبِ افسانہ خواں تک آپکی تھی داستان میری
 چراغاں میں سُنی اک بے دفانے داستان میری
 نہ حیرت رائیگاں میری نہ حسرت رائیگاں میری
 ہوئی جاتی ہے پیشانی بھی وقف آستان میری
 ادھر جتیا بیاں ترتیب دیتی ہیں فغاں میری
 تماشہ ہے کہ غمبختی جاتی ہے فغاں میری
 بجنور میں آگئی ہے کشتی عمر رواں میری
 سُنا کرتا ہے کوئی دل میں بیٹھا داستان میری

بیاں کرتی ہیں شمعیں انجمن میں سوزِ دل میرا
 چمن میں ملیں کتنی ہیں صفد داستان میری

نمبر ۱۹۳۸ء

اک غنچہ نگیں ہے پھر شہم تاشا میں
 کیا عشق کی آنکھوں سے قطرہ کوئی ٹپکا ہے
 پھر قیس کی وحشت نے ابکیس کیا بدلا
 پھر شیوہ خود داری و ترانہ تنہا ہے
 آغاز محبت کی اللہ کے دھچپی
 ہر آن فراغت تھی، ہر گام عبادت تھا
 کیا چیز سرت ہے یہ بھول گیا جیسے
 سورن کی تمازت میں جھلسا کیا جواہری
 برسوں جسے ٹھکرایا گردش نے زمانے کی
 کیا جانے کہاں ڈوبے یہ کشتی دل اپنی
 تابانی عارض کو پرفے کی ضرورت کیا
 سمجھا گئے وہ شاید کچھ دل کو ٹھکا ہوں سے
 پھر بھول بستے ہیں آغوشِ تنہا میں
 اہماتِ بلا طم میں ٹھہرے ہوئے دریا میں
 اکتاہٹ ہے بگولا سا پھر دامنِ محسوس میں
 کاٹنا سا کھٹکتا ہے پھر اک نل رسوا میں
 ہر محبت تمہیں تم تھے پھیلی ہوئی دنیا میں
 اللہ وہ کیا دن تھے جو کٹ گئے صحرا میں
 یوں دل کو ملی لذتِ آلامِ تمنا میں
 کچھ چھاؤں ملی اس کے لہجے چلیپا میں
 ذلت کا خیال آئے کیا اس بلِ سوا میں
 کھاتی ہوئی بچکولے طوفانِ تمنا میں
 چھا جائے گی اک حیرتِ خود شہم تاشا میں
 صفدر یہ سیکوں کیوں جذبات کی دنیا میں

اکتوبر ۱۹۳۳ء

ہر اک لمحہ کے جاں بے احت کی گھڑی کسی
 ترے لطفِ بزم نے اٹھائے دل میں نواہوں
 پیام آتے ہیں لعنِ عمر کے اور غافل ہوں
 طبیعت میں نہیں سو دنیائے فراقِ حیاتِ قی
 شہیدِ ناز کی تربت پہ کچھ کہتے ہیں کچھ گل ہیں
 ترا اقرارِ سچا ہے تو آنکھوں میں بزم کیوں
 ترا انکارِ جھوٹا ہے کہ تیرا دل دھڑکتا ہے
 نہ ہو نگلیں خالص نے عرض اُن کو منالے گا
 تلمونِ حُسن کی فطرت تڑپنا عشق کی قسمت
 جو تیرا نامِ خلوتِ محفل آرائی نہیں کرتا
 یہ سچ ہے آپ اور سوزِ محبت اے معاف شدہ
 نگاہِ حُسن نے کیفِ فراوانِ جب سے بخشا ہے
 تری دھندلے اپنے عکس بھی رشک کے تہ ہے
 غلشِ ہموں کی دل میں تو صفِ زندگی کیسی
 تری میٹھی نظر نے تلخ کر دی زندگی کیسی
 اے احساس کی اک نعت کئے بخود کیسی
 تو پھر یہ سینہ کو بی کیا ہے چاہے درمی کیسی
 تیری شربِ مہم اے مالِ عشا شقی کیسی
 ترے گلِ رنگِ نٹوں سے چھلکتی ہے غمی کیسی
 بزمِ کوشِ اسکھوں میں جھلک آئی غمی کیسی
 نیا نفاذ کی اک کشمکش ہے برہمی کیسی
 مسلسل ایک حالت ہو تو غم کیسا خوشی کیسی
 تو یہ کیرا تراشی کیا ہے یہ صورت گری کیسی
 مگر یہ آج پلوں پر چھلکتی ہے غمی کیسی
 سرورِ باوداں میرے لیے ہے بخود کیسی
 تو پھر یہ نازِ خود میں کیلئے آئینہ گری کیسی

محبستِ ذلتِ رفتہ مجھ کو اس منزل میں لے آئی
جہاں رو نہ بھی اب آتا نہیں صفِ مہر کی کمی

ستمبر ۱۹۳۸ء

ہوا چمک کے خجل کامیاب ہونہ سکا
 وہ ابتداءِ محبت، وہ ارتباطِ نظر
 حریفِ رحمتِ دریا سراب ہونہ سکا
 جو واقعہ نہ بنا اور خواب ہونہ سکا
 مسلم آپ سے حسنِ ادا کی پختائی
 مری نظر کا بھی لیکن جواب ہونہ سکا
 نثارِ جذبِ محبت کہ انفعال اُن کا
 کہ شمع بن گیا لیکن حجاب ہونہ سکا
 گدازِ غم کی یہ کیفیتیں کہاں ملتیں
 نہ ہے نصیب کہ میں کامیاب ہونہ سکا
 حقیقتوں نے لباسِ محباز اُتار دیا
 تمہارا راز مگر بے حجاب ہونہ سکا
 نگاہِ شوق مری اُن حدوں کو چھو آئی
 گمانِ عقل جہاں باریاب ہونہ سکا
 ہزار رنگ سے فطرت جواں مئی لیکن
 ترے شباب کا کوئی جواب ہونہ سکا
 یہ اعتبارِ محبت کہ احتیاط پہ بھی
 مری نگاہ سے اُن کو حجاب ہونہ سکا
 اُسی سے کوئی محبت کی لذتیں پوچھے
 جو بد نصیب کبھی پارِ یاب ہونہ سکا
 تری نگاہِ دو عالم سے بے نیاز رہی
 مری نظر سے مگر اجتناب ہونہ سکا
 بے وقت جس کے تعاقب میں آج بھی صفد
 وہ رہ گزریں رہا بارِ یاب ہونہ سکا

جولائی ۱۹۳۸ء

دُور پہ پہنچا تھا کہ موت آگئی دیوانے کی
 تیرے صحرا میں کس دیدہ خونبار سے رنگ
 اپنی پُرکیت نگاہوں کا اثر دل پہ نہ پوچھو
 چھلکی جاتی ہیں ستاروں کی متور بنکیں
 دیکھتے دیکھتے رندوں کا جنوں جاگ اٹھا
 حلقہ زلف رسا، حلقہ آغوش جمال
 ہلکی ہلکی ہوئی یا رب وہ نگاہیں کیا ہیں
 رفتہ رفتہ یہ بڑھا سلسلہ کیفیتِ نظر
 ایک تبسم دمِ آخر کہ حکایت ہو لذیذ
 تیری آنکھوں سے جو قطرہ کوئی ٹپکے اے شمع
 جامِ مہتاب سے ڈھلنے لگی رنگین شراب
 خالِ مشکیں کا تصورِ خم گیسو کا خیال
 کیا سے کیا کہ گیدہ جو شر جنوں میں عقل
 انتہا کتنی اچانک ہوئی افسانے کی
 کن قنناؤں پہ بنیاد ہے دیرانے کی
 جام میں رنی کچنی آتی ہے میخانے کی
 اور تہید ابھی ہے مرے افسانے کی
 دامنِ ابریں تصویر تھی میخانے کی
 کتنی نگینیں میں کر دیاں مرے افسانے کی
 شان ہے جن میں چھلکتے ہوئے پیمانے کی
 ایک ایک بوند میں تصویر ہے میخانے کی
 انتہا کچھ تو رجائی رہے افسانے کی
 جان آجائے ابھی خاک میں پروانے کی
 کتنی پُرکیت فضا ہے مرے غم خانے کی
 یہی دچھپ بلائیں میں سیہ خانے کی
 دیکھتی رہ گئی صورت ترے دیوانے کی

اک محبت ہی نہیں کتنے جنوں ہیں عقد
کس کو فرصت یہاں ہوشییر آجانے کی

جون ۱۹۳۸ء

ہمارے دل کی آہیں جانیں گی یوں ایٹھاں کب تک
 نہ دیکھے گی نگاہ برق چشم باغبر کب تک
 تری شانِ کرم کی دستوں سے مجھ کو شکوہ ہے
 یہ مانا حُسن کی تاثیر سے ہنٹوں پہ مُسر ہیں
 دلِ یابوس میں اک لُسی اُنھ کر بیٹھ جاتی ہے
 پگھل جائے گا لوہا غم کے شعلوں کو بھڑکنے دو
 کوئی دعویٰ کرے کیا اُن کا جلوہ اُن کا جلوہ ہے
 نقابِ لالہ و گل کی اُڑادیں دجیاں آخر
 لبوں تک آئے رکھ جاتی ہے اُن کی یاد کی لے سی
 عقیدت مند کو کافی ہے سایہ بھی تصور کا
 کریں گے سازشیں مل کر زمین و آسمان کب تک
 چھپے گا قیوں کی اوست میں ہوں آئیاں کب تک
 غلام میں ہر طرف کھٹکی پھیرے میری فغاں کب تک
 مگر جذبات کے مارے نہ نکولیں گے زبان کب تک
 مگر کب تک؟ فریبِ آرزو یہ اتھاں کب تک
 جنوں کا راستہ روکے رہیں گی بیڑیاں کب تک
 مگر پھر بھی فریبِ مہر و ماہ و ککشاں کب تک
 جنوں برداشت کرتا یہ مجاہدِ میاں کب تک
 بتائے نامِ رادی عشق کا حُسن گماں کب تک
 کسی کی بے رخی دیکھو تو لے گی اتھاں کب تک

جب احساسِ خودی گم ہو جائے عشقِ تیر صفد
 تو پھر یہ شورِ جذبات کب تک فغاں کب تک

فروری ۱۹۳۸ء



گنبراکے میرے خانہ دیراں میں آگئے
 تم کیوں فریبِ نالہ بجسراں میں آگئے
 اک میرے اضطراب کا اللہ رے معجزہ
 تنو امتشار کیسوئے پیاں میں آگئے
 کیونکہ نہ فتنہ ہو رنگِ شبِ ہتاب کا
 وہ چاند بن کے خانہ دیراں میں آگئے
 جمعیتِ خیال سے میری خفا تھے وہ
 کیسو بدوش خواب پریشاں میں آگئے
 قطراتِ پڑ گئے تھے جو طوفانِ شوق سے
 گل سوئے اتفاق سے مڑگاں میں آگئے
 تم تو کھڑے تھے ساحلِ دریائے عشق پر
 کس طرح سیلِ دیدہ گریاں میں آگئے
 طوفان اٹھا رہے تھے جو کچھ سادہ دل تھا
 شاید وہ خود بھی اتنی اسی طوفان میں آگئے
 فتنے بچے ہوئے تھے جو تخلیقِ حشر سے
 ترتیب پاکے پیکرِ جاں میں آگئے
 اے بیرونی لغزشِ آدم تری پنہ
 ہم بھی فریبِ جذبہ نصیاں میں آگئے

ستاروں میں نور ہے نہ فضاؤں میں کیفیت

عقدا اتر کے وہ دل دیراں میں آگئے

مری شوق تصور کا حراں معلوم ہوتی ہے
 پیش سینے کی پھر آتش فشاں معلوم ہوتی ہے
 خودی کے دائرے کو عشق نے فہمی اس قدر
 یہی ہے زندگی تو چند سانسوں کا بھر سہ کیا
 چمن کی زینتیں کیا آئینہ دکھائیں گی ان کو
 طلسم رنگ کا دھوکا نہ کھائے دیرہ بنش
 چھپاؤں بھی تو دل کا بھید ظاہر ہو سکے ہوتا ہے
 یہ افسوں نظر شاید جوانی کا کرشمہ ہے
 محبت اس تلاطم میں تھی جس اُمید پر قائم
 حجاب اٹھتے گئے بڑھ گیا احساسِ محرومی
 بکاہ معتبر نے اس طرح ذروں کو چپکایا
 جہاں سے آنسوؤں میں رنگ آتا ہے تنہم کا
 مجھے پھونکے ہوئے بکلی کے نکلے بھی گلستاں میں
 ہواک شے ان کا سنگ آستان معلوم ہوتی ہے
 پھر اک حسرت مے ل میں جہاں معلوم ہوتی ہے
 کہ ہر اُفتاد اپنی داستان معلوم ہوتی ہے
 ہوا پر ہم کو بنیا دجہاں معلوم ہوتی ہے
 یہ بگینی انھیں کی ترجمان معلوم ہوتی ہے
 کہ یہ دنیا مقام امتحان معلوم ہوتی ہے
 کہ اپنی ہر نظر اب تو زبان معلوم ہوتی ہے
 جدھر نظریں انھیں ہر شے جہاں معلوم ہوتی ہے
 وہ اک تنکا بہ سیلابِ رواں معلوم ہوتی ہے
 نظر بھی اب حجابِ درمیاں معلوم ہوتی ہے
 کہ اب تو یہ زمین بھی آسمان معلوم ہوتی ہے
 وہیں سے کچھ فرے کی داستاں معلوم ہوتی ہے
 یہ بربادی بھی حُسنِ آشتیاں معلوم ہوتی ہے

سکوت شب میں کہیں تاروں کی لکھنؤ باقی رہا یہ سب میرے دل کی ہر لڑواں معلوم ہوتی ہے

تصور کے اُجالوں میں اے ترتیب مے مختار

پریشاں تیرے دل کی داستان معلوم ہوتی ہے

اگست ۱۹۳۴ء

کیا زیست آبدنگ کا جو کاکیں جسے
 اہل نگاہ خواب زمینا کیں جسے
 کم ہانگی جبرأت دیدار کی قسم
 دیکھا ہے یوں انہیں کہ نہ دیکھا کیں جسے
 اک مگرے تلامذہ جذبات کا پتھر
 پلوں پہ ہے وہ بوند کہ دریا کیں جسے
 حسرت بھری نظر نے انہیں دیکھ کر
 ایسا بنا لیا ہے کہ اپنا کیں جسے
 اک قلب مضطرب کہ باب ہے مثل جام
 اک چشم بادہ ریز کہ مینا کیں جسے
 اس کھول پہ کیا ہوا اہل بصیرت کو اعتبار
 وہ جلوگی ہے آج کہ پردا کیں جسے
 نظارہ لئے حسن کا حاصل نہ پوچھے
 اک خیرگی متاع تماشا کیں جسے
 کس کی نظر کا فتنہ شورش پسند ہے
 یہ محشر حیات کہ دنیبا کیں جسے
 بخشی ہے دل کے زخم کو تیرے خیال نے
 وہ تازگی کہ جان قتل کیں جسے
 نالہ یہی ہے جب تو اثر کا سوال کیا
 اک ایسی کیفیت ہے کہ غنہ کیں جسے
 پھیلے تو کائنات ہے سمٹے تو اک نگاہ
 یہ نازِ حسن ایک کنایہ کیں جسے
 ذرہ بھی ناز کرتا ہے اپنے وجود پر
 ٹٹھی میں ہے وہ چیز کہ صحرایں جسے
 بایں ہمہ نمودِ شرر زندگی ہے کیا
 اک کھیل آب و گل کا تماشا کیں جسے

اک افضل سا وہ دل کے گھر و مئے کی طرح ہے
ہفتدیرِ میشتِ خاک کہ دُئیہ کیس جے

جولائی ۱۹۳۷ء

مگر خلوت میں ہم پیش نگاہ یار ہوتے ہیں
 بھلا یہ شمع کیا ہوگی انیسر شاہ آہنائی
 انھیں کی یاد سے روشن درو دیوار ہوتے ہیں
 تصور ہو تو غم کی رات بھی بھاری نہیں ہوتی
 وہ خود آ کے تسکین دل بیمار ہوتے ہیں
 شفق کی مریخیاں رنگینیاں صحن گلستاں کی
 یہ مضر خونِ حسرت کے لیے تیار ہوتے ہیں
 کچھ ایسے ہیں کہ ممنونِ نگاہ یار ہوتے ہیں
 کچھ ایسے ہیں کہ پیاسِ خم سے بھی نہیں بچتی
 نگاہِ شوق سے وہ برسرِ پیکار ہوتے ہیں
 میر آئینہ ہو لکھش ادا کا جا زد لے کر
 ترے بعد سے شاہِ آستان یار ہوتے ہیں
 مبارک لے حسین شوق تجھ کو یہ سرفرازی
 کہ یہ آدابِ رُوح بندگی پر بار ہوتے ہیں
 مرے مبعود کچھ ترسیم کر رسمِ عبادت میں
 نگاہیں خیر ہوتی ہیں تو دل بیدار ہوتے ہیں
 کہ تیرے حُسن کے خود مائل دیدار ہوتے ہیں
 دہن سے مچھول جھڑتے ہیں بن گھڑا ہوتے ہیں
 محبت کے سوا سب مشغلہ بیکار ہوتے ہیں
 کہ یہ رستے مسافر کے لیے دشوار ہوتے ہیں
 قیام کی زبانیں عقل سے یہ کستی جالی ہیں
 نہ جائے دل اُدھر سے ہو جدھر سایہِ خنجر کا

خدا کی بندگی کا فرض ہوتا ہے ادا صفہ
ترے بعد جو صرف آستین یار پہنیں

جلن ۱۹۳۷ء

کھا کر فریب اُس کا عادیہ نہ کیجئے
 ہر بار امت مبارکِ زمانہ نہ کیجئے
 کیجئے پر اس طرح بھی تمنا نہ کیجئے
 توہینِ چشمِ شوق گوارا نہ کیجئے
 افقِ زمینِ زندگی کو سمجھئے نہ رائیگاں
 ہر قولے پہ سجدہ شکرانہ کیجئے
 آنکھوں میں اُن کی آگیاں ایک نگِ فعال
 اے دل بس اب شکایتِ حیا نہ کیجئے
 دھوکا نہ ہو کہیں کہ ستمگر ہیں آپ بھی
 ذکرِ جفا پہ آنکھ نہ جھکایا نہ کیجئے
 خود حوصلہ دیا تھا محبت کو آپ نے
 اب جسراتِ نگاہ کو روانہ کیجئے
 میں اور خیالِ ترکِ محبتِ غلطِ غلط
 آپ امت مبارکِ شہرتِ حیا نہ کیجئے
 جہنمِ نظر میں ہے اک کائناتِ شوق
 اندازہٴ ہجومِ تمنا نہ کیجئے
 دیوانگیِ عطیہٴ لطفِ نگاہ ہے
 اب سازِ داریوں کا تقاضا نہ کیجئے
 اک لفظ میں سیٹ دیا ہم نے عشق کو
 آپ اس کو طول دے کے فسانہ نہ کیجئے
 خاموشِ اتجاؤں کی پرستش کیں ہیں
 یہ کس کا مشورہ ہے کہ نالہ نہ کیجئے
 عشقِ خودی میں ہے یہی شکلِ مفاہمت
 یعنی کہ عشق کیجئے تمنا نہ کیجئے
 شام و بحرِ خدا سے دُعا مانگ مانگ کر
 مصدقِ تیوں کے عشق کو روانہ کیجئے

جنونِ مشق ہے صفدر کبیر دل سے نکلے گا
جو اس کو بے میں آئے گا نری شکل سے نکلے گا
نیتو کچھ تو میرے غیظِ لا حاصل سے نکلے گا
چمن میں آگ چھڑکے گا جزا دل سے نکلے گا
نظر دل سے نہ ہٹ جائے کیسے ذوقِ نظارہ
کائن کا کاروان ناز اسی منزل سے نکلے گا
ہراساں کیوں ہے گر کشی بخنور میں آگئی دل کی
محبت کا سفینہ ڈوب کس ساحل سے نکلے گا
سمٹ آئیں اگر آنکھوں میں برقِ حسن کی لہریاں
تو اک شعلہ جہاں افروز میرے دل سے نکلے گا
اڑائی ہے جو خاک اہل سفر نے اُس کو چھٹے دو
کوئی رستہ اسی گروہ منزل سے نکلے گا
حرم کیا بلکہ ہے بھی کر نہیں سکے قبول اُس کو
فریبِ لطف کھا کر جو تیری محفل سے نکلے گا
خلوصِ دل یہ کہتا ہے قدم آگے بڑھائے جا
کوئی خود سکر کر پردہ محفل سے نکلے گا
وہ خود دیکھیں گے اپنے حسن کی یہ عالمِ آشوبی
پہلو بھی مری وافر سنگی دل سے نکلے گا
بجائے جا چکیں گے جب بساطِ عرش کے تارے
ہمارا چاند بھی ہنس کر حرمِ دل سے نکلے گا
ہماری آرزو ہے خواہشِ محبوب کے تابع
ہمارا اندھا نکلا تو اس کے دل سے نکلے گا

مری شعلہ نوائی پھونک دے گی بزم کو مقدر

پسینہ شمع کا بھی گرمی محفل سے نکلے گا

کس جگہ ہم ہیں کیس کی جلوہ گاہ ناز ہے
 دل کی خود داری یہاں مقدر سپر انداز ہے
 ارتباط باطنی کا یہ بھی اک اعجاز ہے
 اُن پہ دنیا مٹ رہی ہے اور ہم کو ناز ہے
 عشق کو ہر چند اپنی بے خودی پہ ناز ہے
 حُسن کا اندازہ پھر بھی حُسن کا انداز ہے
 دیکھئے انجہام کیا ہمہ حسرت دیدار کا
 ہم سراپا شوق ہیں اور وہ سراپا ناز ہے
 پھر مے نالے فلک سے جا کے مچرانے لگے
 آج پھر کانوں میں میسے دُور کی آواز ہے
 اللہ اللہ حُسن تیری عالم آشوبی کہ تو
 اک زلزلے پر عیاں ہو کر بھی اب تک راز ہے
 زیرِ پا آئے تمہاری جستجو میں مہر و ماہ
 اور ابھی تک مسکرا سناں مارل پر واز ہے
 دل سراپا ننگی اور لب سراپا خاشی
 عشق تیری گفت و گو کا بھی عجب انداز ہے
 حسرت لے ذوق تماشا ڈگمگاتے ہیں قدم
 وہ بٹھے آگے جسے تابِ نظر پر ناز ہے
 دیکھئے اس مرحلے میں کس کی ہوتی ہے شکست
 ہم کو دل پر اُن کو اپنی دلبری پر ناز ہے
 رنگِ سُرخ نے رفتہ رفتہ کدھی ساری استلا
 ہم سمجھتے تھے فحش پر وہ دایرہ راز ہے
 دیکھئے یہ صبر پر یا ماہ پر ڈالے کسند
 دوست خاموشی کو میری خواہ کچھ مفہوم دیں
 ابتداءِ زندگی اک عالم پر واز ہے
 راز کی جو بات تھی عقدِ وہ اب تک راز ہے

ہم بھی کچھ دُور نہیں آپ بھی کچھ دُور نہیں
 حُسنِ تاریخ کو دُہرائے یہ دستور نہیں
 کیجئے غور تو پرنے میں بھی ہے شانِ ظہور
 پائے ساقی پہ بھی ہو جاتی ہے تندوں کی نماز
 کوئے جاناں کے چلکتے ہوئے ذمے میں گواہ
 بارِ ہجرت میں یہ میں نے کیا ہے محسوس
 نالہ گرم ہی کافی ہے اگر ضبط نہ ہو
 زندگی مانگتی تھی ایک شعاعِ اُمید
 پُرسشِ حال پہ مائل ہیں نگاہیں اُن کی
 بوئے گل، نالہ، بلبل، نفسِ سرور نسیم
 کیفیتِ دیدہ رنگیں کی سلامت ساقی
 بس یہی کہتے کہ ملنا ہمیں منظور نہیں
 دارِ منصور نہیں، جلوہ گاہِ طور نہیں
 حُسنِ مستور نظر ہو کے بھی مستور نہیں
 میکہے میں کوئی پابندی دستور نہیں
 کس جگہ میری نگاہوں کے لیے طُور نہیں
 آنکھ سے دُور ہیں وہ دل سے مگر دُور نہیں
 برق کچھ دل نشین سے بہت دور نہیں
 نہ سہی اُن کے تبسم کو جو منظور نہیں
 دل کا یہ نگ کدک بات کا مقدور نہیں
 کون اس باغ میں آزاد ہے مجبور نہیں
 کون پہنائے میں اس جااے غمخوار نہیں

اپنی بے کیفی فُسر یاد تو دیکھو صُفدر

نالہ نالہ ہو تو نالے سے اثر دور نہیں

بنا کر چارہ سازِ دل جنوں فتنہ سماں کو
 نگاہِ ناز میں آج ایک میلانِ مہم ہے
 پدل کی جاگتی چنگاریاں شعلہ نہ بن جائیں
 مری آنکھوں کی حیرانی بجائے خود ہے معذوری
 قفس کی تیلیاں اڑاڑ کے جاتی ہیں تل تک
 نظر ان کی محبت کو نہ دے الزام بیتابی
 سب کس ناز سے منہ چومتی پھرتی ہے کیوں کا
 مزے آنے لگے ذوقِ خلش کے لے لے مضطر
 الٰہی اس سے بڑھ کر نا اُمیدی اور کیا ہوگی
 تم اپنی جنبش لبہ انہیں ترتیب دے دیتے
 یہ فصلِ گل کی آمد اور یہ پابندیِ تمکیں
 کسی کی مست آنکھوں سے متاعِ کیف لے لے کر
 جن آنکھوں کو بصیرت دی ہے صفہِ دمِ گل نے

سمجھتا ہوں میں ننگِ پیر میں جیبِ گرہیاں کو
 بڑھ لے حسرتِ مقنا تمام لے لب ان کے اماں کو
 لپک ان کی کہیں چھو لے نہ بڑھ کر ان کے اماں کو
 یہ معذوری مبارک ہو حالِ فتنہ سماں کو
 مے ذوقِ پرافشانی پیرت ہے گلستاں کو
 وہ آتے ہیں کوئی سی دے مے چاکِ یہاں کو
 میرا کن حسرت بھری نظروں سے تکتا ہوں گلستاں کو
 تصور میں یونہی جنبش دیے جاؤں کے پیکاں کو
 کہ ہم نے سوئپ میں آزادیاں آغوشِ زنداں کو
 فراہم کر رہا ہوں دل کے اجڑے پریشاں کو
 جنوں یہ بھی خبر ہے نہ دکھانا ہے بیاباں کو
 مے نعروں نے میخانہ بنایا ہے بیاباں کو
 وہ چڑھتی ہیں ہر فتنے میں تلتِ گلستاں کو



بٹھاکے ہم اُن کو دل کی غلوت میں داغ اپنے دکھا رہے ہیں
 بجھے چراغوں میں روشنی ہے وہ زیر لب مُسکرا رہے ہیں
 تجلیاں چھین رہی ہیں حلین سے راستے جگمگا رہے ہیں
 قریب ہے آدمی کی منزل فرشتے پر وہ اُٹھا رہے ہیں
 ابھی وہ صورت دکھا رہے تھے ابھی وہ صورت چھپا رہے ہیں
 مرا تصور ہے اُن کا پر وہ اُٹھا رہے ہیں گرا رہے ہیں
 وہ سانولی اور سلونی صورت نمک چھڑکتی ہے زخیم دل پر
 کہ بڑھ رہی ہے خلش کی لذت تو زخمِ دل مُسکرا رہے ہیں
 خوشایہ لمحاتِ شامِ فرقت کہ ہے تصور کی شمع روشن
 وہ کھول کر ذہن کا دریچہ کھڑے ہوئے مُسکرا رہے ہیں
 یہ گدگداتا ہوا تبسم جگر کی شورشِ بڑھاتا ہے
 یہ مُسکراتے ہوئے کنائے حجابِ دُوری اُٹھا رہے ہیں
 ہے دُور ابھی تو مقامِ لغزش ہے شوق بھی سے تمام لغزش
 نظرِ نظرِ تھر تھرا رہی ہے 'تم قدم ڈگکا رہے ہیں

ہے اُن کے تابع دلوں کی بستی بھرے ہیں نقوشِ ہستی

بنا ہے ہیں مٹا رہے ہیں، مٹا رہے ہیں بنا رہے ہیں

جیسا ہے آنکھیں جھکی ہوئی ہیں، لبوں پہ آہیں رکی ہوئی ہیں

نہ کچھ مرے دل کی سُن رہے ہیں نہ اپنے دل کی سُنا رہے ہیں

قدم میں لغزشِ نظر میں ہستی، لبوں پہ اک طنزیہ تبسم

تری محبت کا آئینہ ہیں جہاں کو حیراں بنا رہے ہیں

ہے اُن کا جھپٹا ہوا تبسم سرورِ تجدیدِ عہد و پیمیاں

نظر ہے گوارہٴ متناہل و جگر مُکرا رہے ہیں

حجابِ خورشید و ماہ و انجم، شبابِ ریحان و لالہ و گل

پڑا ہے عکسِ جال کس کا کہ سب کے سب جگمگا رہے ہیں

مری تمنا کی نامرادی سے کھٹل رہی ہیں دلوں کی آنکھیں

تمہاری دنیا میں میرے نالے نیا شعور اک جگا رہے ہیں

ہے یہ بھی اک عشقِ مہکا کر شمعِ گماں کی خدّتِ یقینِ بنی ہے

فریبِ ذوقِ نظر ہے صفِ دودھ آ رہے ہیں نہ جا رہے ہیں

دسمبر ۱۹۳۶ء

جو رہ گئے تھے کرشمے دکھائے جاتے ہیں
 ہم اس طرح محفل بنائے جاتے ہیں
 اگر ظہور یہی ہے تو پھر حجاب ہے کیا
 خوشایہ آئینہ داری کہ نافذ ان جمال
 جفا کے بعد ہے عذر جفا بھی ایک ادا
 یہ کس نے توڑ دی تو بہ کہ میکدے والے
 سکون آہ سے ملتا ہے قلب سوزاں کو
 وفا شعار ہیں تھے اٹھی ہمیں یہ نظر
 نگاہِ رنہیں کیسا یہ کیفیت ہے ساقی
 وہ کاروانِ عقیدت گزر گیا لیکن
 انھیں سے لیتی ہے محفل تری چراغ کا کام
 تمام رات تائے ہیں گوش بر آواز
 شکستہ حالی سب مزار کہتی ہے
 یقینات کے پردے اٹھائے جاتے ہیں
 کس احتیاط سے پردے اٹھائے جاتے ہیں
 قریب آ کے بھی وہ دُور پائے جاتے ہیں
 کس اہتمام سے سب مل بنائے جاتے ہیں
 نظر خجل ہے مگر مسکرائے جاتے ہیں
 جو میکدے میں ہے سب کچھ کٹائے جاتے ہیں
 اسی ہوا سے یہ شعلے بجھائے جاتے ہیں
 جو معتبر ہوں وہی دل دکھائے جاتے ہیں
 کہ تیرے پائے سبک ڈلگائے جاتے ہیں
 نشانِ سجدہ سرِ راہ پائے جاتے ہیں
 جو داغِ سینہ شاعر میں پائے جاتے ہیں
 یہ کس کے ساز سے نغمے سنائے جاتے ہیں
 کہ تڑتوں کے نشاں تک مٹائے جاتے ہیں

حضورِ دوست یہ اندازِ باریابی ہے زبان بند ہے لبِ تھر تھرائے جاتے ہیں

یہ جلوہ گاہ ہے مسجدِ نہیں ہے اے واعظ یہاں تو ذوقِ نظر آزمائے جاتے ہیں

پھر آ رہے کوئی پردہ دار کیا صقدہ

چراغِ بزمِ تمصور کھجائے جاتے ہیں

نومبر ۱۹۳۶ء

خیالِ خواب کی دُنیا میں ملا کے ٹوٹ لیا
 طریقی رہنی رنگ رنگ دیکھے ہیں
 حُریم دل میں اُنہیں شوق نے جگہ دی تھی
 نگاہِ ساقی تو بہ شکن کو کیا کہئے
 میں چُپ ہوں لذتِ دیدار کی خلش پا کر
 غرورِ حُسنِ خفا ہے کہ اے جنوں تو نے
 کسی کے حُسن کو اپنا بنا لیا ہوں میں
 ترے حجاب نے چُپ کر دیا گواہوں کو
 گلوں کے بھیس میں رول کے روپ میں گونے
 نگاہِ شوخ نے بجلی سی دل میں دوڑادی
 بڑھے جو کئے بُتاں سے تو کعبہِ تھامراہ
 رُکے جو ہم تو تبسم سے حوصلہ بخشا
 کلی بھی میری محبت پہ سُکراتی ہے
 وہ جن کو ٹوٹ پہ تھا اپنی نازکے مفرد

تری قم تجھے تجھ سے چھپا کے ٹوٹ لیا
 نظر ملا کے نگاہیں چُرا کے ٹوٹ لیا
 اُنھوں نے شوق کا سر پایہ آ کے ٹوٹ لیا
 کہ ایک جُرمِ شیریں پلا کے ٹوٹ لیا
 وہ جس رہے ہیں کہ سہل بنا کے ٹوٹ لیا
 ادائے چاکِ گریباں دکھا کے ٹوٹ لیا
 کسی کے حُسن نے پنا بنا کے ٹوٹ لیا
 کہ یہ کون ہیں سُکرا کے ٹوٹ لیا
 حقیقتوں کو تماشا بنا کے ٹوٹ لیا
 پھر اُس کو درِ مجسم بنا کے ٹوٹ لیا
 قدمِ قدم پہ عیس آزما کے ٹوٹ لیا
 بڑھے جو ہم تو نگاہیں پھرا کے ٹوٹ لیا
 بھری ہماریں بکس بنا کے ٹوٹ لیا
 انھیں بھی کل غزل اپنی سُنا کے ٹوٹ لیا

اپنی آنکھوں میں لئے شب کا خمار آہی گیا
 برہمی سچی تھی لیکن دل کو کیوں آتلیقین
 ایک مبہم سی نظر اور اُس میں مبہم سا جواب
 لئے تصور اس خرابے میں بھی چٹکی چاندنی
 ہم سے چوچو اُن کی نظروں کا طلسم التفات
 لُن ترائی کہہ کے بھی کچھ سُکرائی برقِ طور
 نالہ دل سوزِ غم سے تربیت پاتا رہا
 جس نے اک مٹھی نظر کی دل ہوا اُس نے سار
 اللہ اللہ اعتبارِ شوق کی خوش فہمیاں
 اک ادائے دلبری پر مٹ گئے ہوشِ خواہاں
 تیرے چہرے کے مکد رکا ہوا دل پر اثر
 ناز نے پہرے بٹھائے جنبشِ لب پر مگر
 اُس کی خود داری کو بھی تیری غفلتِ نفیست

صبح سے پہلے وہ جانِ انتظار آہی گیا
 دلہ ہی جھوٹی تھی لیکن اعتبار آہی گیا
 دل مگر جو بیاہے تسکیں تھا قرار آہی گیا
 آخر اُس شستِ سرائے دل میں یا آہی گیا
 درد باقی ہے مگر دل کو قرار آہی گیا
 یعنی طرزِ لگنتِ سائل پہ پیار آہی گیا
 رفتہ رفتہ ایک طرزِ خوش گوار آہی گیا
 مسکرا کر جس نے دیکھا اُس نے پیار آہی گیا
 میں یہ سمجھا جیسے وہ جانِ بہار آہی گیا
 لاکھ سمجھا یا دل بے اختیار آہی گیا
 آخر اس آئینے پر بھی غبار آہی گیا
 اک متمم آنکھ میں بے اختیار آہی گیا
 لبِ پھنڈر کے بھی شکوہ بار بار آہی گیا

اٹھو صفدر دلِ خشتِ زردہ کا اتھاں کر لیں
 سحر کی منفعل آہوں سے کھیلِ فغاں کر لیں
 مری پتیا بوسے دو انہیں اک لمحہ فرصت کا
 کہ وہ اپنی نظر کا میسے دل پر امتحاں کر لیں
 ہمیں لے شوقِ دوداہ پر اپنے بھروسے
 جہاں چاہیں وہاں پیدا جو اہلِ تمہاں کر لیں
 براہِ راست وہ جلوہ دلوں اب مخاطب ہے
 زباں دانِ محبت تم چشمِ وزباں کر لیں
 میں جس تائے کو دیکھوں اس کے دل کو نورِ مجید جانے
 وہ جن فتوں نہیں میں ان کو شکستِ کیشاں کر لیں
 یہ کعبہ بھی تو ان نقشِ جبینِ اہلِ طاعت ہے
 ترے مجذوب جس تپ کو چاہیں آستان کر لیں
 چمن کا تینکا ترنکا اک بانِ حال ہے گویا
 انہیں کو کیوں نہ پھر ترقیب سے کدال کر لیں
 تیرے تو نہیں دیتے زباں کو اذنِ گویائی
 ہم اپنا حال ان لکھوں ہی لکھوں میں کر لیں
 جوابِ جلوہ برقِ تجلی ان کو دینا ہے
 وہ خود کو دیکھ کر میری نظر کا امتحاں کر لیں

حرم میں رہ کے شوق اپنا سبک سربن گیا حقد

بُتوں کو سجدہ کر کے کیوں نہ اس کو سمر گراں کر لیں

ستمبر ۱۹۳۶ء

آئیے جب بن رہے تھے عکسِ حبیبِ نام تھا
 پھر ہاتھ عارضِ گل پر مری نظروں کا رنگ
 یاد آیا ہے کبھی اپنا بھی تھا دورِ نشاط
 کو نہ تھی پھرتی تھی چشمِ شوق میں برقِ جمال
 چشمِ حیرت کا ہوا جو جس کھویا لطفِ دید
 اُن کی آنکھوں میں بھی فرطِ غم سے آنسو آگئے
 ذرے ذرے کی زباں پر تھی شدِ دردِ عشق
 ہر شکستِ دل پہلے ہر شکستِ دل کے بعد
 مژدہ صبحِ مسرت بھی ہے اب جس پر گراں
 علم بکھر بکھا کے ہم حسن کو ہنگامِ خمیز
 تیرے میخانے میں بھی آیا تھا دورِ باختیار
 کیا زمانہ ہے کہ اس لبِ پر خدا کا ذکر ہے
 یاد تو ہوگا تمہیں وہ شاعرِ آشفہ حال

یعنی جب کچھ بھی نہ تھا تو تیرا جلوہ عام تھا
 کس قدر نگینِ طلوعِ شوق کا ہنگام تھا
 ہم نے جس ساغر کو دیکھا وہ ہمارا جام تھا
 وہ بھی کیا دن تھے کہ لبِ چمن اُن کا نام تھا
 ورنہ اُن کی ہر ادا میں ریت کا پیغام تھا
 کتنا تابندہ جوابِ حسرتِ ناکام تھا
 راز رکھنے پر بھی دل کا راز کتنا عام تھا
 اُس ننھے فعل میں اک نیا پیغام تھا
 یہ وہی دل ہے جو مومنِ انتظارِ نام تھا
 غور سے دیکھا تو دل ہی محشرِ آلام تھا
 اپنا اپنا ہاتھ تھا اور اپنا اپنا جام تھا
 کیا زمانہ تھا کہ اس لبِ پر بتوں کا نام تھا
 جس کو تم کہتے تھے مجنوں جس کا کھنڈ نام تھا



طاقتِ صبر ہے یا راءِ شکیبائی ہے
 حُسنِ آئینے میں خود اپنا تماشا تائی ہے
 نوحہ کر آگئے موت آگئی اب دیر ہے کیا
 جگ لگاتی ہے ستاروں سے گزر گاہ تری
 اُن کی آنکھوں میں پھر آنسو ہیں خدا خیر کے
 پکھنچ لایا ہے تصور میں انھیں جذبہ دل
 دیکھنا یہ ہے کہ کس محبت برستے ہر فرد
 اُسی آغوش میں اے کاش مجھے غش آجائے
 دفعتاً ہو گئے جذبہ باتِ محبت بیدار
 اب تو آجاؤ کہ دُر سے نہیں ملتی ہے نگاہ
 بار بار توڑ دیئے باندھ کے پیاں میں نے
 دل میں کس ماہِ حبس کا ہے تصوّرِ قہقہہ
 پھر بھی پردے نے نہ اٹھنے کی قسم کھائی ہے
 جرأت اے عشق سی وقتِ حبسِ سائی ہے
 وہ بھی آئیں جنھیں دعوائے میحالی ہے
 آنے والے یہ مرا فیضِ حبسِ سائی ہے
 اک کہانی نغمہِ یاس نے دہرائی ہے
 آج تو حسرتِ دیدار کی بن آئی ہے
 اک اُمٹتی ہوئی بدلی تری انگڑائی ہے
 جس کی خوشبوئے بدن ہوش میں آئی ہے
 کیا قیامت تری ٹوٹی ہوئی انگڑائی ہے
 رُوحِ بیتابِ ان آنکھوں میں سٹ آئی ہے
 بار بار اُن سے نہ ملنے کی قسم کھائی ہے
 جس کا پرتو ترے اشعار کی عنائی ہے

۹ اگست ۱۹۳۶ء

خبر کیا کشتہ ذوقِ سفر کو اپنی منزل کی
 خدا جانے خودی کو ہوش کب لائے کہاں آئے
 ہو بن بن شے پکسِ حشریں چشمِ تناسے
 سمجھ لیتی ہے جب شتی حقیقتِ ہوش طوفان کی
 وہ جاتے ہیں مگر خوشبو تو اپنی چھوڑے جاتے ہیں
 مرا ساغر ہے نازک سینہ دینا دھڑکتا ہے
 تحمل سنگِ مانگ اور استقلالِ ساحل ہے
 وہ رنگِ سخی ہے صفدرِ حبی و اہوِ حاصل کی
 خدا جانے کہاں لے جائے دل کو بخودی دل کی
 نظر نے اُن کی چھیڑا تھا اگر کھل گئی دل کی
 تو ہر گرواب میں صورتِ نظر آتی ہے ساحل کی
 ٹھہرائے رنگِ رخِ رونق ابھی باقی ہے محفل کی
 نہ جانے تندی جذباتِ حالت ہو کیا دل کی
 اور ان اجزائے پھر کس کراں مضطربِ دل کی

کرتھے ہیں یہ صفدرِ اضطرابِ فحیم و کمانی کے

پیش کیا نہرِ تاباں کی ضیا کیا ماہِ کامل کی

میں دل کو دیکھتا ہوں کہ وہ دل نہیں رہا
 یعنی ترے خیال کی منزل نہیں رہا
 دُنیا کے التفات کے قابل نہیں رہا
 جو دل تری نظر سے گرا دل نہیں رہا
 اقرارِ شرب پھر متبسم لبوں سے ہے
 پھر حشرِ عتبار کے قابل نہیں رہا
 اللہ سے خیال کی معجز نائیاں
 مجھ کو گمِ ان دوری منزل نہیں رہا
 اس دل کو کر دیا غمِ دنیا نے پائمال
 اب یہ تری نگاہ کے قابل نہیں رہا
 آنکھوں میں شکلیں ہیں تصویریں گل کدے
 یا ایں ہمہ میں رونق محفل نہیں رہا
 ہر شے کو دی نظر نے تری تابِ زندگی
 لیکن ادھر اٹھی تو مراد دل نہیں رہا
 جب حالِ دل یہ ہے تو کسی غم کا کیا سوال
 اب یہ خوشی کا بھی محفل نہیں رہا
 کس رو پہ بہہ رہی ہے مری کشتیِ حیات
 ساحل بھی میرے واسطے ساحل نہیں رہا
 ہر شوق نامراد ہے ہر سعی رائیگاں
 اب کچھ سوائے حسرتِ حاصل نہیں رہا
 دیکھا جسے وہ کشتہ ناز و آوازاں
 اب اعتبارِ ابروئے قاتل نہیں رہا

صفدِ نگاہِ شوق بھی گستاخ ہو چلی

وہ احترامِ پردہ محفل نہیں رہا

راز و نیازِ عشق کے قابل بنا دیا
 اُن کی نظر نے دل کو مرے دل بنا دیا
 اس ملگے لب اس پہ آرائشیں تیار
 تم نے تو سادگی کو بھی قابل بنا دیا
 برقِ دھڑ کو دے کپش اور اضطراب
 جو بیج رہا اُسی کو مرادِ لب بنا دیا
 چارہ گری نے آپ کی چھو کر نگاہ سے
 ہر آبلے کو دردِ بھرا دل بنا دیا
 اب اُن تجلیوں کا ہو کس طور سے نفوذ
 جن کو حیا نے پردہِ حائل بنا دیا
 دل ایک مُشتِ خاک تھا تیری نگاہ نے
 مٹی کو سوزِ عشق کے قابل بنا دیا
 تیرے ظہورِ حُسن نے تحلیلِ نور کی
 اجڑائے منتشر کو مرادِ لب بنا دیا
 آغواںِ ربط میں نگہِ جاں نواز نے
 دل کو تری اُمید کے قابل بنا دیا
 آنکھوں کو انتظار کی بیداریاں ملیں
 سوزِ نفس کو گرمیِ محفل بنا دیا
 فطرت کو ہے گلہ کہ مرے اضطراب نے
 حاصل کو برق، برق کو حاصل بنا دیا
 جب شوقِ تازہ دم تھا تو منزلِ بےِ تہی
 جب تھک گئے تو راہ کو منزل بنا دیا

صفدر یہ اُن کی فتنہ نہ پای تو دیکھئے

پھولوں پہ پاؤں لکے کے اُن میں لب بنا دیا

آنکھوں میں عشوہ بٹے فسوں گرے ہوئے
 کس نے چھڑک دی آکے بیا بیاں نہ پندگی
 محشر میں جب پکار ہوئی اہل عشق کی
 اے تیغِ ناز اُدھر بھی اچھتا سا کوئی وار
 آنکھیں جو ہم گُل میں تجھے ڈھونڈتی ہیں
 پیانے سب کے بھر گئے مینا تھی ہوا
 ہر نقشِ پایہ چھلک گئی پیشانی نیاز
 قیامت میں بقی چال میں فتنے نظر میں بحر
 آنکھیں میں خود چھلکے ہوئے جام کی طرح
 اچھا نیازِ عشق کے بھلے نہ ہوں قبول
 تاثیرِ خونِ اہلِ وفا رنگِ لالی ہے
 آیا شبابِ آپ کا محشر لے ہوئے
 عارضِ میں رنگِ بادۂ احمر لے ہوئے
 جاتے میں لیے دلِ مضطر لے ہوئے
 ہر برگِ گلِ چین میں ہے محضر لے ہوئے

صفدر یہ میرا دل ہے محبت کا آئینہ

اک حسُنِ دل نواز کا جوہر لے ہوئے

بنائے لے نگو لطف بے قرار مجھے
 ستانے لے نگہ ناز بار بار مجھے
 خوشادہ عالم بیتابی فراق کہ جب
 کسی کے حسن کی عنایاں شایع ہیں
 کہاں وہ موج تبسم کہاں کی منہسی
 میں کاروبار چین سے خفا تو تھا لیکن
 اب ان جھکی ہوئی نظروں گفتگو کیا ہو
 دُعا ہے یہ کہ نہ بدے سنگری کا مزاج
 پکارتا ہی رہا آشیاں کا ہر تنکا
 تری جفا بھی نہ ہوستقل تو کیا شکوہ
 اُسی پکار پہ اب تک شوق گرم خرام
 خلا میں دُور تارا سا ٹٹاتا ہے
 یہ سُرخ ترخ سے ڈوے میست نگاہ

بلاے گر نہ رہے دل پہ اختیار مجھے
 رہا نہ تیرے تبسم پہ اعتبار مجھے
 غم کے کی چیز تھی تکلیف انتظار مجھے
 بڑھاسکے گانہ اب عالم ہمار مجھے
 دیا فریب شبابست نے بار بار مجھے
 سنا کے لے گئی رنگینی ہمار مجھے
 کہ معذرت نے کیا جن کی شرمسار مجھے
 دُعا ہے یہ کہ نہ آئے کبھی قرار مجھے
 اڑا کے لے ہی گیا جلوہ ہمار مجھے
 رہا نہ اپنی دُعا پر بھی اعتبار مجھے
 تمہارے دل نے پکارا تھا ایک بار مجھے
 کہاں پہ چھوڑ گئی لا کے یاد دیا مجھے
 بنانا دیں کہیں صفدر گناہگار مجھے

عشق نامتبر نہ ہو جائے خامشی فتنہ گر نہ ہو جائے
 زلفِ بچاں کے انتشار کو روک شوقِ آشفہ سمر نہ ہو جائے
 لطفِ عنارت نہ ہوتا کا آہِ دل با اثر نہ ہو جائے
 لذتِ درد کی دُعا میں ہیں کیوں خفا چارہ گر نہ ہو جائے
 یہ دلِ بے خبر پہ لطفِ نگاہ آشنا کے نظر نہ ہو جائے
 چمن نہ جائے نشاطِ بے خبری آگہی درِ دس نہ ہو جائے
 دلِ بے تاب یہ تری دھڑکن موت کی راہبر نہ ہو جائے
 یہ ہم آغوشیاں تصور میں کہیں اُن کو خبر نہ ہو جائے
 نہ میسر اگر ہو لذتِ عشق زندگی درِ دس نہ ہو جائے

اُن کے وعدے اگر وفا ہو جائیں
 زندگی مستبر نہ ہو جائے

جنوری ۱۹۳۶ء

تھے غم کی ہر سُو فلو دانییاں ہیں اتق تا اتق دل کی دیرانیاں ہیں
 خر مگی پشیمان جنوں بھی پشیمان بقدرِ طلب سب کو حیرانیاں ہیں
 ہوا لکی لکی، گٹا بسکی بسکی نہ بکے تو یہ دل کی نادانیاں ہیں
 نہ پوچھو اس آغوشِ ارماں کی مدد کہ آباد ہو کر بھی دیرانیاں ہیں
 غم دل کی یہ سو گواہی نہیں ہے بنامِ محبت تن آسانیاں ہیں
 ہجومِ تجلی میں گم ہیں نگاہیں نظر بندیاں ہیں کہ تابانیاں ہیں
 ابھی تک تذبذبِ حیرتِ ذوقِ ایمان بڑی دل با کُفر سامانیاں ہیں
 بڑھیں ایسی دشواریاں زندگی کی میسر ترے غم کی آسانیاں ہیں
 یہ آنسو تسلی سے کیا رک سکے گے کہ دل میں وہی شعلہ سامانیاں ہیں
 تجلی کے سینے میں بھی رک شر ہے اسی کا قہقہہ یہ تابانیاں ہیں
 زمانہ نہیں چپاگ دامانیوں کا جدھر دیکھئے پاک دامانیاں ہیں
 ہوس کیوں اُسے پاک دامانیوں کی میسر جسے چاک دامانیاں ہیں
 شریعت کی داناٹیاں ان پہ صدقے یہ صفدرِ محبت کی نادانیاں ہیں

پھانس اک رہ گئی ادھر دیکھو دیکھو دیکھو پھر اک نظر دیکھو
 سوز پروانہ ایک لمحہ ہے شمع جلتی ہے رات بھر دیکھو
 ہوئی مانوس تیرگی جو نگاہ کتنی جلدی ہوئی سحر دیکھو
 بسکے ہے پاس در دجی اک فرد تم بھی سوئے نہ رات بھر دیکھو
 دل تہارے لئے لہو ہو گا اب کوئی دم میں ہے سحر دیکھو
 عظمت دید کا تقاضہ ہے آنکھ بیکار ہو مگر دیکھو
 خوب بھی ہیں گردشیں لیر چاند کا رات بھر سفر دیکھو

لوگ جاتے ہیں سوئے دیرو حرم
 تم بھی صفدر کسی کا گھر دیکھو

جب ہمیں دل پہ اختیار آیا حسن خود ہو کے بے قرار آیا
 سر جھکائے گناہ کار آیا اُن کی شانِ کرم کو پیار آیا
 لے مجھے دل پہ اختیار آیا تیرے غمِ زوں کو بھی قرار آیا
 ایک دم جتنی نہیں گریباں ہیں ہائے کب موسمِ بہار آیا
 اُن کا جلوہ تھا آئینہ بردار گیسوئے زیست میں سنوار آیا
 سادہ لوحی تو دیکھئے دل کی جھوٹے وعدوں پہ اعتبار آیا
 اُن کی مغل سے عشق کیا لاتا بوجھِ بول پہ کتنا اتار آیا
 اب تو بے جمعِ خاطر کا سوال تیری دنیا کو میں سُنا دیا
 نہ ملا میری بندگی کا جواب جنگدے میں بھی میں مچا دیا

دل میں مفقود کسی کا عکس نہیں

شاید آئینہ میں غبار آیا



پھر ملتی ہے شوق نگاہِ عتاب کا
 کچھ حوصلہ بڑھا دل خانہ خراب کا
 جنبش میں دل کی طرح ہے گوشہ نقاب کا
 نئی پھر نہ جلتے اُن کی طرف نقاب کا
 عارض کی سرخیاں ہیں کہ رودادِ خونِ دل
 رودادِ خونِ دل ہے کہ عالم شباب کا
 جلووں نے جیسے لوٹ لیا قتلِ ہوش کو
 آنکھوں کو صرنا یاد ہے اٹھنا نقاب کا
 وہ پھول چن لیا کہ جو تھا حاصلِ پیار
 قائل ہوں عشق کی نگاہِ انتخاب کا
 ہم سن رہے ہیں جیسے کوئی اجنبی سُنے
 کچھ لوگ کہہ رہے ہیں فسانہ شباب کا
 پندارِ حسن و جذباتِ نظر میں ہے کشمکش
 حافظِ خدا ہے آپ کے بند نقاب کا
 آنکھ کا کیا تصورِ ہواؤں کی کیا خطا
 چھپتا نہیں ہے آپ ہی عالم شباب کا
 زیرِ نقاب کچھ ہے اگر شدتِ جمال
 اُلے گا خود بخود کوئی گوشہ نقاب کا
 پوچھو اُن کی سرخسوں مے خونِ لکال
 عارض ہے جو رنگِ گلابی شباب کا

صفدر جگاہی ہیں زمانے کی شکریں

لیکن ہنوز شوق پہ عالم ہے خواب کا

درس دیتی رہی نیرنگی عالم مجھ کو
کچھ سیکھا تار مار بیٹھ گل و شبنم مجھ کو

کامراں کوئی ہوا کس کو ملی داد و ست
کیوں ہوا اپنے دل ناکام کا ماتم مجھ کو

تم میرا ہوش جو ہوں گے مبارک سے بخش
کیا یہ کچھ کم ہے نہیں فکر دو عالم مجھ کو

میری غیرت اسے تو بینِ وفا بھیسے گی
غیر کو بھی وہ عطا ہو جو ملا عنسم مجھ کو

رویا میں جن کیلئے وہ مری قسمت پہنچے

راس آئی نہ وفا صورتِ شبنم مجھ کو

اپنی تھمیل کے گل اپنے تصور کے منم
فکر آئے تو بے پکیر میں شبنم مجھ کو

اپنی محرومی قسمت کا لگہ کیا حقدار

میں نے کی جس سے وفا اُس نے دیا غم مجھ کو



جب گردشِ حیات سے ہم تنگ آئیں گے
 آنکھوں کو اُن کی چوم کے ساغر اٹھائیں گے
 ہم سے اُمید رنگِ وفا ہے زمانے کو
 ہم ہیں جو اعتبارِ محبت بڑھائیں گے
 تعمیرِ آشیاں کا اگر حوصلہ رہا
 ہم بجلیوں کی زد پہ بھی تنکے جمائیں گے
 مجروح ہونہ جائے کہیں اُن کا اعتماد
 سُنتے ہیں غیور پر وہ ستم آزمائیں گے
 سلوار ہاتھ اپنا گریباں جنونِ عشق
 اِس کی خبر نہ تھی کہ وہ پھر مُسکرائیں گے
 دونوں طرف سے تازہ آبِ مائلِ نیاز
 صدفِ کو آپ، آپ کو صدفِ منائیں گے



ہم سے روشن ہونا نام آپ کی زیبائی کا
 اس نتیجے میں ہے کیا دخل تمنائی کا
 کس کی زلفوں کے تصور ہے تار یک فضا
 مدعیانِ خرد توڑ دیں زنجیر اپنی
 صبحِ عشرت پہ ہوئی یوثرِ ظلمتِ ایسی
 دیدنی ہے یہ ترا چاکِ گریباں لے عشق
 کس کی وحدتِ جمیعت کی یک بینی کی
 نئی دنیا میں بھی محبوب ہے یہ ہم کس
 کلمہ پڑھتے رہے ہم حُسن کی یکتائی کا
 تیرا ہی جلوہ ہے باعثِ تری رُسوائی کا
 جھلملاتا ہے دیا عشق کی مینائی کا
 یہ بھی منشا ہے تجھے حُسن کی انگڑائی کا
 رات سے مل گیا عالم مری تنہائی کا
 کس سے کیا ہے سلیقہ یہ خود آرائی کا
 کس کی خلوت ہے عالم مری تنہائی کا
 کون نکر ہے محبت کی دل آرائی کا

دل کی آنکھوں میں چکا چوند ہے تحفہ ہشیار

امتحان لیتے ہیں جلوے تری مینائی کا

آنکھیں کھلیں صفدر زنجیر نظر آئی یہ خواب جوانی کی تعبیر نظر آئی
 رگ رگ میں محبت کی تنویر نظر آئی اک پیکر خالی کی توقیر نظر آئی
 آفاق کا ہر جلوہ اپنا ہی کرشمہ ہے آئینوں میں اپنی ہی تصویر نظر آئی
 کھلنے جو لگے عقدے اُس گیسوے پر خم کے اے لفظ وفا تیری تفسیر نظر آئی
 اک عجز سراپا ہے اک ناز مجسم ہے تصویر کے پہلو میں تصویر نظر آئی
 ہوا زمینوں پر تدبیر کے جلوے تھے ٹھوکر جو کہیں کھائی تقدیر نظر آئی
 جب گھر کے گھٹا آئی بھڑکا ترا دیوانہ لہرائی ہوئی سبلی زنجیر نظر آئی

صفدر نے کیا جب بھی غور اپنی تشاہد
 تخریب ہم آغوش تعبیر نظر آئی

آنسوؤں کی چند بوندیں زریبِ ہر گال گئیں میری خوش فہمی سے میرے حق میں غماں گئیں
 ویدنی تھان کا اطمینان میرا اضطراب سواطحِ زلفیں نہیں اور پھر پریشاں گئیں
 دُورلوں میں چل رہی تھی مدتوں کے گفتگو آج نظریں بھی شریکِ عددِ پیمیاں گئیں
 آئینہ وار مزاجِ حسن میں زلفیں تری جب مجھے آغوش تک آنی چاہی پشیاں گئیں
 ہو کا عالم کیوں ہوں میں کہ اکٹئید نے بستیاں تھیں بسائی تھیں وہ دیراں گئیں
 وقتِ آسائش بھی اب نہیں ہے دل کو ذراغ حواکِ عالم میں وہ زلفیں پشیاں گئیں
 ذہن ان چچائیوں کا اتباعِ قب کیا کئے صبحِ تین ماضی کی جو خواب پریشاں گئیں

داستان میں نگ کیا بھرے جگر میں کہاں
 چند بوندیں تھیں جو صفِ زریبِ عنواں گئیں



جنوں کو ننگ ہے پابند سلوٹیاں ہونا
 غبارِ راہ بن بن کر بیاں ہونا دہاں ہونا
 جہنم کا تکلم اور نموشی کا زباں ہونا
 ہر اک قطرہ چن چن لالہ دگل بن کے چمکے گا
 وہ لذت چمن گنی درِ محبت جبرِ تازاں تھا
 کبھی تو لے گا اپنا فرض اتیے خواہش سے
 محبت بھی نہیں محفوظ قانونِ تغیر سے
 زمانہ سن ہے فخر کرے میری دُروانی
 ہے لے ہنشیں ہم موہم گل میں بھی پژمردہ
 فسوںِ عشق کی نیز بھگیاں جی کوئی کیا جانے
 فغاں کو چاہئے ہر حال میں صفدر فغاں ہونا
 لکھا تھا میری قسمت میں دلیل کا رواں ہونا
 عجب انداز سے ٹھہرا ہے دل کا اتناں ہونا
 نہیں نکلن شہیدوں کے لہو کا رائیگاں ہونا
 کسی کا مہر ہاں ہونا بھی ہے نامہ ہاں ہونا
 مرا کھیلے پیر اٹھ اٹھ کے سر گرم فغاں ہونا
 یہ وہ لذت تھی جس کو چاہئے تھا جاوداں ہونا
 تری قسمت میں لکھا تھا کسی کی استاں ہونا
 ہمیں کیا اس آباہِ نیت باغِ جہاں ہونا
 ہمارا اقتباہِ شوق اُن کا بدگساں ہونا

یہ کیا جو کہے لیکن مبارک ہو تجھے صفدر
 کسی کی داستاں میں تیرا زیبِ استاں ہونا

دسمبر ۱۹۳۳ء

ہونٹ نمیش میں ہیں چپکے پکیر نہیں
 ہم تو سر کھنڈر کے مرنے پہ بھی آمادہ ہیں
 یہ مگر حسرتِ گفتار ہے گفتار نہیں
 آپ شیر اٹھانے کو بھی تیار نہیں
 سامنے راہِ عدم اور مسافر تنہا
 تیرے تیور ہی ترے قول کو بھٹاتے ہیں
 کوئی بستی نہیں کوچ نہیں بازار نہیں
 آنکھیں کچھ کہتی ہیں اور لب بہ ہر بار نہیں
 ایک پر اگندگی عام کا عالم ہر سمت
 کیا یہ دنیا تری اٹھتا ہوا بازار نہیں
 یہ بھی احسان تھا اُن کا کہ اٹھائی نہ نقاب
 جانتے تھے کہ ہمیں طاقت دیدار نہیں
 ضعفِ ارادے کا ہے طاقت کی لکھی فیضان
 سوچے یوں تو گنگاؤ گنگا نہیں
 اے چمن تجھ کو خزان مجھے تو نے لوٹا
 یوں لٹا ہوں کہ گریباں میں کی تار نہیں
 شرط انصاف ہو اس کا تحمل کیوں کر
 گریہ دوست ہے یہ خندۂ اغیار نہیں

دونوں ہی دل کے اٹلے ہیں مگر غم خرم
 عشق اور قتل میں صقدر کوئی پیکار نہیں

مارچ ۳۳ ۱۹۶۶



وہ اک رازِ حیاں تھے ہو گئے آخر نہاں کیوں کر
 تجلی بن گئی صفدرِ حجابِ درمیاں کیوں کر
 مجھ کو آرزو اس دل کی ویرانی سے گھبرا یا
 شہرِ تارِ منزلِ ویراں میں کوئی کارواں کیوں کر
 وہ آنکھوں میں ہیں لیکن دل کی منزل دُور ہے پھر بھی
 اُنھیں کوئی پرچے ہوں گی طے یہ دُورِ باں کیوں کر
 حقیقت میں نظر تو بامِ پر بھی جاس نہیں سکتی
 بناتا ہے مقصورِ آسماں پر آسماں کیوں کر
 ہے اک آنسو کا قطرہ گوشہ چشمِ قفا میں
 غرورِ حسن اک طوفاں کو رکھتا ہے نہاں کیوں کر
 ہوائے تند کا احساں ہے میری خاک پر در نہ
 زمانے پر عیاں ہوتیں مری بربادیاں کیوں کر
 دنِ صافدر کی بے شک مجرمِ یک جنبشِ لب ہے
 زباں رکھتے ہوئے بن جائے کوئی بے زباں کیوں کر



رنگ و نیرنگ جہاں شام و سحر دیکھا کئے
 اک تناشا تھا جسے ہم مگر بھر دیکھا کئے
 اُپر سے طین کے جھانکا بھی نہ سورج نے کبھی
 اور سورج کے پجاری سونے درد دیکھا کئے
 شمع کی تنویر کو بڑھتی رہی گھٹتی رہی
 ٹکٹکی باندھے مگر ہم تا سحر دیکھا کئے
 نامرادانِ حین کھولے ہوئے آغوشِ شوق
 ٹھٹھتے آوارہ کی گرد سفر دیکھا کئے
 دیدنی تھی دونوں جانب احتیاطِ ضبطِ شوق
 ہم ادھر دیکھا کئے اور وہ ادھر دیکھا کئے
 گردِ مسلسل بھی نظر آئی نہ صفدرِ دودھ تک
 صبح سے تا شام سونے رہ گذر دیکھا کئے



بلا سے ، دل میں رہے ، دل کے پار ہو جائے
مگر نگاہِ کرم ایک بار ہو جائے

مری دنیا پہ تجھے اعتماد ہو کہ نہ ہو
تری جفا پہ مجھے اعتبار ہو جائے

نہ نکستیں ہوں پریشاں نہ سینہ چاک ہو گئی
چمن پہ میرا اگر اختیار ہو جائے

ہے شانہ بڑھتے ہیں اور سامنے ہے آئینہ
ہے وقت وہ کہ شکاری شکار ہو جائے

خزاں پہلے ہی آئے گی اس کے دل پہ خزاں
جسے ہزار میں پھولوں سے پیار ہو جائے

محبت اُن کی کستی ہے مرے دل میں نہاں ہو کر
 تجھے بے چین رکھوں گی میں بے نام و نشان ہو کر
 حقیقت یوں بھی اپنے راز کی تشریح کرتی ہے
 یہ کہتا ہے مرا چاکِ گریباں دھبیاں ہو کر
 الٰہی خیر اُن کا راز ہونٹوں تک نہ آجائے
 محبت لے رہی ہے چکیاں دل میں نہاں ہو کر
 جہاں ہے دھوپِ عارض کی دہاں زلفوں کا سایہ بھی
 دل سوزاں کو ٹھنڈک دے رہا ہے سائباں ہو کر
 سُوے پستی جھکے، جھکنے پڑا بارِ بلندی سے
 کھلی ہم پر بلندی کی حقیقت آسماں ہو کر
 یہی عشوے جو ہم سے مانگتے ہیں اک نظرِ صفد
 یہی نقدِ خودی مانگیں گے کل ہم سے جواں ہو کر



وہ عشق ہو کہ خرد کچھ تو دود خدا کے لیے
 اک آگ چاہئے خاشاکِ ماسوا کے لیے
 مریضِ عشق کی آنکھوں میں خیر گی آئی
 نقاب اب تو الٹ دیکھئے خدا کے لیے
 یہی وہ ہیں جنہیں محسوم کہتی تھی دنیا
 وہی ہیں یہ کہ جو مشہور ہیں جفا کے لیے
 ہوس نے بھی تو کیا تیرا احترام اے حسن
 نقابِ عشق کی اوڑھی تری حیا کے لیے
 ہماری خاک بھی اٹھوار ہے ہیں کوچہ سے
 کسے یہ کون کہ رہنے بھی دود خدا کے لئے
 وفا کا بھیس بدل کر جو دل کو دے سکیں
 ترس رہے ہیں بہت دن سے املِ جفا کے لیے
 وہ ہاتھ جن میں کہ تھی کل تلک چٹری مقدر
 اٹھے ہیں آج مری قبر پر دُعا کے لیے



منظر آتا نہیں دریا کا کنا راہم کو
 لئے جاتا ہے کہاں وقت کا دھارا ہم کو
 دیکھ لو گرم نگاہوں سے دوبارہ ہم کو
 بھانگیا ہے یہی ہند از قمارا ہم کو
 طرز اغیا سے کچھ کم نہیں پیدا حباب
 آپ کے عشق میں یہ بھی ہے گوارا ہم کو
 سمیتیں ہونے لگیں دریاے محبت کی عیاں
 مل ہی جاتے گا کسی روز کنا راہم کو
 کوشش ضبط سلسل سے بنا شوق جنوں
 مرض عشق میں پرہیز نے مارا ہم کو
 وہ بندی کہ جہاں سے ہو حقیقت مشکوک
 نہیں اے عالم پر واز گوارا ہم کو
 مختصر یہ کہ کہیں کے نہ رہے ہم صفت
 عشق میں فرض کے احساس نے مارا ہم کو



ہم تو دوری میں بھی قربت کا مزا لیتے ہیں
 دل میں اک چاند سی تصویر بنا لیتے ہیں
 کس کو پہچان ہے سنگ و رجاں کی یہاں
 جو بھی چوکھٹ ہو سرِ عبسز جھکالیتے ہیں
 سینہ شوق ہے ہر چند کہ تکریم بہ سب
 کوئی طوفاں مگر اٹھے تو دبا لیتے ہیں
 سونے لگتی ہیں فضا میں تو ترے دیوانے
 اپنی سوئی ہوئی زنجیر جگا لیتے ہیں
 وہ ترا شعلہ رخ ہو کہ مساجد کا چراغ
 جن کو اک شمع جلانی ہے جلا لیتے ہیں
 دو نگاہوں میں تصادم تو بڑی بات نہیں
 لوگ ہر بات کو افسانہ بنا لیتے ہیں
 صفد اک ہم ہیں کہ ہے سر پہ جہاں احساں
 ایک وہ ہیں جو زمانے کی دُعا لیتے ہیں

وہ بیٹھے بیٹھے ہوئے کیوں خفا خدا جانے

ہوئی ہے کون سی ہم سے خطا خدا جانے

درازئی شب، عسراں کا سلسلہ مت پوچھ

کہاں سے آئی یہ کالی بلا خدا جانے

تری نگاہ بھی معصوم، حسن بھی معصوم

سکھائی کس نے یہ طرزِ جفا خدا جانے

ہر ایک جذبہ مبہم کی ہو چکی تحلیل

مگر مزاجِ محبت ہے کیا خدا جانے

حیات و موت کے حلقے میں تا چرندِ نگاہ

کہاں پہ ختم ہو یہ سلسلہ خدا جانے

یہ بار بار جو آتی ہیں، ہچکیاں صفدر

کسی نے یاد مجھے کیوں کیا خدا جانے



ایک دم بھی جسے اس دل سے بھلایا نہ گیا
 وہ قریب آیا تو سینے سے لگایا نہ گیا
 کر دیا جلوہ رخسار نے ایسا بے خود
 ہم سے احوالِ دل زار سنایا نہ گیا
 اجنبی بن کے سرِ راہ ملے ہیں مجھ سے
 جن کی دیوار کا سر سے مئے سایا نہ گیا
 میرے پہلو میں جو اک چیز تھی کیا ہو گئی وہ
 ہم ہیں اور تم ہو، یہاں پر کوئی آیا نہ گیا
 یوں تو اس دوش پہ تلو بارگراں تھے لیکن
 نازاک تیسری محبت کا اٹھایا نہ گیا
 بڑھ گیا فرض کا احساس جنوں کی حد تک
 لیکن اس سر سے تری زلف کا سایا نہ گیا
 پی گیا اشک کا طوفان بھی صفتِ رلیکن
 رنگ چہرے کا ہر حال چھپایا نہ گیا

۶۱۹۳۲

اگر وہ بھول کے بھی یاد کر لیا کرتے

تو ہم بھی عرضِ تنہا کا حوصلہ کرتے

ہنگامہ ہر تھی غیروں پہ ہم چپ چشمِ عتاب

یہی تھا دل میں تو انصاف بھی خدا کرتے

خدا بنا لیا ہم نے بھی حسنِ دالوں کو

پرستشِ اس سے زیادہ بُتوں کی کیا کرتے

اُنہیں کا نام تھا ورنہ زباں ہر اک لمحہ

اُنہیں نے درد دیا تھا وہی دوا کرتے

تبسمِ لبِ نازک کی یاد گر آتی

دوا کو درد تو اس درد کو دوا کرتے

یہ اپنی شومی قسمت کہ اٹھ سکا نہ نقاب

زمانہ ہو گیا ہم سے اُنھیں حیا کرتے

یہ دُتیا ہے خدا کا کارخانہ یوں ہی چلتا ہے
 جو جلتا ہے سو پھلتا ہے جو پھلتا ہے سو جلتا ہے
 نہ وہ تم ہو نہ وہ ہم ہیں مگر اب بھی یہ حالت ہے
 کوئی جیسے کہ سینے میں کھجے کو مسلتا ہے
 لگن کس کی ہے یہ آخر اکشش کس کی ہے یہ آخر
 کہ سرستِ ازل ہر گام گر گر کر سمجھتا ہے
 کوئی پوچھے تو کہہ دینا مریضِ غم کی بیتابی
 تقوٰی میں کسی کے ہر نفس کو وٹ بدلتا ہے
 یہ دنیا فرض کی دنیا نہیں بازار ہے صفد
 یہاں تو عشق بھی اب عقل کے سانچے میں چلتا ہے

نوائے پریشاں

متفرق اشعار

جب ذہن پہ دمے نہ لگا تا شرارے
تخیل نے چھٹکائے پر اگندہ تارے

نہ روم و دے کی نہ چین و ختن کی بات کرو
 خود اپنے گھر کو سنوارو وطن کی بات کرو
 بسی ہے ذہن میں اب تک خزاں کی دیرانی
 ہمارے دھڑکنے جیسے چین کی بات کرو
 جہاں سے نغمہ دل بے سُنائے ٹوٹا ہے
 دھڑکتے دل سے اُسی انجن کی بات کرو
 یہ تلخی عظیم ایام کم جو کرنی ہو
 تو دوستو کسی شیریں سخن کی بات کرو
 دیارِ غمیر کے پھولوں کو پوچھنے والو
 کبھی تو اپنے گل و یا سمن کی بات کرو
 حیات موت کے آغوش تک جب آپہنچی
 تو خلعتوں کی نہیں اب کفن کی بات کرو
 اگر قبول ہو صفدر کی یہ نوا سنجی
 تو دل نوازی اربابِ فن کی بات کرو

شورِ ناقوس میں اندازِ اذال ہے کہ جو تھا

عکس تیرا کسی چہرے میں نہیں ملتا ہے
آئینہ بزم میں ہر سونگراں ہے کہ جو تھا

نگہ و جلوہ میں باقی ہے ابھی تک دُوری
بیچ میں پردہ باریک گماں ہے کہ جو تھا

حسن اور عشق میں اب تک ہے ربطِ قدیم
خونِ دل غارِ رخسارِ بتاں ہے کہ جو تھا

ہر طرف دانش و دہیں کی میں دکانیں صفد
چار سو معرکہ سو دوزیاں ہے کہ جو تھا

اکتوبر ۱۹۶۲ء

جئے دھما ہی رہی تیری معصوم سادلی
گولا کھ رنگ شوق پھرے جارہا ہوں میں

○
اب تک ہے یاد اُن کی اُچھلتی ہوئی نگاہ
اک چوٹ تھی کہ دل پہ سے جارہا ہوں میں

○
مخرو میوں پہ کوئی تو آفسوہ سائے گا
افسانہ حیات کھے جارہا ہوں میں

○
اک منفعل نگاہ ہے سرمایہ حیات
اک نو لگی ہوئی ہے جئے جارہا ہوں میں

○
تری نگاہ و کرم نے دیئے ہیں درسِ وفا
ترے خلوص سے سیکھی ہیں وسعتیں دل نے

بالیا ہے رقیبوں کو رازہ داس میں سے



نہ چھڑائے مطرب رنگیں نوا یہ سنا نہ ہنسنے دے
دبار کھا ہے سینے میں کسی کا راز نہ ہنسنے دے



ہجوم جلوہ ہے وجہ سکوت اے صفد
مذاق دید نے تصویر کر دیا ہے مجھے



حیرت ہے میری آئینہ حشرِ آرزو
تصویرِ رنگِ مدام کس کے خیال میں

نگاہِ شوق کو پھر شعلِ مے پرستی ہے
جریمِ حُسن سے چھین چھین کے مے پرستی ہے

اُن کا جلوہ نہ سہی اُن کا تصوّر ہی سہی
شمعِ غم خانہ کسی کو تو بسایا ہوتا

ہوش میں کوئی کب نہیں ہوتا
جب وہ ہوتے ہیں تب نہیں ہوتا

فریب آرزو میں طالبِ دیدارِ میٹھے ہیں
نکل کر نرم سے اُن کی پسِ دیوارِ میٹھے ہیں

اُس کو فریب دے نہ سکے کافسوںِ دہر
جس کی نظریہ رازِ دُعا عالم ہو آشکار

بہمی زلفوں کی رازِ اک کہہ گئی
ابروں تیرہ بختی رہ گئی

رقصِ طاؤس

○ شادابیِ تخیل

○ شگفتگیِ بیان

○ نفسیاتیِ دقیقہ سنجی — اور

○ جدید تئصال نگاری — کا جمال

ڈاکٹر سید صفدر حسین کی نظموں کے مجموعہ "رقصِ طاؤس" میں

موجود ہے جس کے متعلق حضرت جوش ملیح آبادی نے فرمایا

اللہ رے ترے شعر کا تابندہ جلوس

نظروں کو مٹھاس ہو رہی ہے محسوس

لفظوں کا سجاوہ ہے کہ تختِ بلقیس

معنی کا بہاؤ ہے کہ "رقصِ طاؤس"

یہ خوش رنگ مرقع شائع ہو چکا ہے

قیمت چار